نوائے نقوی

(نثری تخلیقات)

مصنفہ

معظمہ نقوی

نوائے نقوی

(نثری تخلیقات)

مصنفہ معظمہ نقوی

خود کو اپنے جب کوئی نکھار لیتا ہے

فن کو اس کے وہ اوجِ لازوال دیتا ہے

معظمہ نقوی

ایم۔ ارسلان پبلیشرز
ملتان فیصل آباد لاہور
0306-5109344

معظمہ نقوی

کی "نوائے نقوی" کا مسودہ میری پیش نظر ہے جس میں تحقیقی، تنقیدی اور ادبی مضامین اور کالمز شامل ہیں۔ جو مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہو کر داد وصول کر چکے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے معظمہ کی نثر پر ماہرانہ گرفت کا پتہ چلتا ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شاعرہ نثر پر بھی مہارت رکھتی ہو۔ تاہم معظمہ نقوی نظم اور نثر دونوں میں یکساں مہارت رکھتی ہیں۔ "نوائے نقوی" میں انہوں نے مختلف موضوعات و شخصیات اور کتب کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے۔ جس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں ادبی کالموں کو بھی جگہ دی ہے۔ ان کے جو کالم نیم ادبی ہیں ان میں بھی ادبی رنگ جھلکتا ہے۔ ان کے تحقیقی مضامین بھی معیار ادب پر پورا اترتے ہیں۔ اپنی اس کتاب سے وہ نثر نگاروں میں شامل ہو گئی ہیں۔ ان کا متحرک ذہن انہیں خاموش نہیں بیٹھنے دیتا اور وہ کچھ نہ کچھ لکھنے میں مگن رہتی ہیں۔ ایسے لوگ مقدار کے نہیں معیار کے قائل ہوتے ہیں۔ میں اس کاوش پر انہیں خراج تحسین پیش کرتی ہوں اور امید کرتی ہوں وہ نثر کے میدان میں بھی متحرک رہیں گی۔

فرزانہ سحاب مرزا

نیدرلینڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نوائے نقوی

نثری تخلیقات

مصنّفہ

معظّمہ نقوی

ایم.ارسلان پبلیشرز
ملتان فیصل آباد لاہور
0306-5109344

کتابیں ہماری
سستی اور معیاری

M ARSLAN PUBLISHERS
ایم ارسلان پبلیشرز

تزئین و اہتمام اشاعت

اعظم سہیل ہارون
راحت امیر خان تری خیلوی
0333-4504891
0306-5109344

نام کتاب؛-----نوائے نقوی
مصنف؛-------معظمہ نقوی
ٹائیٹل؛------فائن آرٹ ملتان
قانونی مشیر؛---سید اظہر حسین سبزواری ایڈووکیٹ لاہور
کمپوزنگ؛-------اعظم سہیل ہارون
نظر ثانی؛--------سید مبارک علی شمسی
سن اشاعت؛-------جنوری 2023ء
تعداد؛---------1000
ناشر؛---------زوہیب پبلشرز حاصل پور
قیمت؛--------1000 روپے

زیر اہتمام
ادبی تنظیم "بزم شمسی پاکستان" (رجسٹرڈ)
0300-7850809/0302-5878787

انتساب

اپنے ہمسفر و ہم نفس
''سید مہدی حسن نقوی''
اور
گوہرِ نایاب بیٹی
''سیدہ معجزہ حسن نقوی''
کے نام

خرد کو اپنے جب کوئی نکھار لیتا ہے
فن کو اس کے وہ اوجِ لازوال دیتا ہے

فہرست

باب سوم (تبصرہ جات کتب)

☆ ---رقت آمیز لہجے کا شاعر

☆ ---انیلا طالب اور رَیم

☆ ---سرائیکی مرثیہ نگاری کا معتبر حوالہ

☆ ---آبِ زمزم

☆ ---شہرِ مراد

☆ ---مرشدِ ماہم

☆ ---فصلِ آرزو

☆ ---صفدر علی حیدری کی ادب اطفال کے لیے خدمات

☆ ---لفظ لفظ حقیقت

☆ ---اک فوجی کی قلم سے

☆ ---ادب نواز شخصیت

☆ ---زاہد اقبال بھیل کی ادبی خدمات

خود کلامی

تمام حمد و ثناء اُس ربِ اکبر کے نام جو تمام عالمین کا خالق و مالک ہے۔ قلم و قرطاس سے محبت و عقیدت مجھے اپنے اجداد سے ورثہ میں ملی ہے، جس گھر سے علم کی خیرات بٹتی ہے اور تکریم جس گھر کی باندی ہے۔۔۔۔ اپنی اس نسبت سے میں نے اپنی مختصر زندگی میں جو کچھ سیکھا اسے اہلِ ذوق کی نذر کرنا ہمیشہ اپنا منتہائے مقصود جانا اور اب ''نوائے نقوی'' کی صورت میں اپنی کچھ نگارشات اہل سخن کی نظر کر رہی ہوں۔ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتی ہوں، میں اپنے حلقہ احباب کی تہ دل سے سپاس گزار ہوں جنہوں نے میری ہر لحظہ ہمت بندھائی ہے اور اک بے نوا سے ''نوائے نقوی'' بننے کا اعزاز بخشا۔ آپ سب کی دعاؤں کی طلبگار

خیر اندیش

معظّمہ نقوی

نوائے نقوی پر چند تاثرات

ڈاکٹر خان محمد ساجدؔ (ملتان)

نثری تخلیقات پر مبنی محترمہ معظمہ نقوی کی کتاب کا مسودہ ''نوائے نقوی'' اس وقت میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ مجھے کہا گیا ہے کہ اس پر کچھ تاثرات قلمبند کروں۔ اس سلسلے میں کچھ معروضات حاضر ہیں۔ اس کتاب کا انتساب معظمہ نے اپنی بیٹی گوہرِ نایاب کے نام کیا ہے۔ محترمہ نے جن مضامین پر قلم اُٹھایا ہے اُن میں اردو تنقید، اردو زبان کی تاریخ، نثر کا ارتقائی جائزہ، سر سید احمد خان کا حسب ونسب، تصوف، حقیقی اور مصنوعی محبت، قتلِ عمد، یومِ عاشور، ادب کے مسائل، کرونائی دور کا ادب، کچھ کتابوں پر تبصرے اور کچھ شخصیات پر تحقیقی مضامین بھی شامل ہیں۔ معظمہ نے تعارفی کلمات میں اپنا تعلق ایک علمی خاندان سے ظاہر کیا ہے اور شاید اسی ماحول کا اثر تھا کہ ان میں ادب سے لگاؤ اور تحقیق کا ذوقِ بلند پیدا ہوا۔

ابتداء میں سب سے پہلے جس شخصیت پر اُنھوں نے اظہارِ خیال کیا ہے وہ ان کے نانا سید مشتاق احمد جعفری ہیں، جو ایک مصور تھے۔ ان کے ننھیال امام موسیٰ کاظمؑ سے منسوب ہیں۔ ان کے دادا سید احمد شاہ صاحب ایران سے ہجرت کر کے ڈیرہ غازی خان میں سکونت پذیر ہوئے اور یہاں کے تمدن میں رچ بس گئے اور سرائیکی زبان ان کے خاندان کی زبان بنی۔ گزشتہ کئی نسلوں سے ان کے خاندان کا پیشہ فنِ نقاشی اور خطاطی رہا ہے۔ سید مشتاق احمد شاہ نے اپنے ہنر کے فروغ کے لئے دہلی اور لاہور کا سفر بھی کیا اور فوٹو گرافی بھی سیکھی۔ بطور گورنمنٹ پینٹر سرکاری ملازمت بھی کی۔ الغرض

آپ کا پورا خاندان بہت سے اوصافِ حمیدہ کا حامل تھا۔

علامہ اقبالؒ پر ان کی تحریر بہت مثبت اور ٹھوس حقائق اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے فکر کی سمت قرآنِ کریم کے مطالعے سے متعین ہوئی۔ وہ اسلاف پرستی کے قائل نہیں بلکہ دورِ جدید کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اجتہاد کے قائل ہیں۔ تعلیم کے معاملے میں صنفی امتیاز کے وہ قطعاً خلاف ہیں بلکہ ان کے نزدیک عورت تمدن کی بنیاد ہے۔ اس سلسلے میں معظمہ نے ان کے کلام سے حوالے نقل کیے ہیں۔ معظمہ کے نزدیک علامہ اقبالؒ مغربی طرزِ تعلیم کے بھی مخالف نہیں تھے۔ البتہ وہ مغربی تعلیم کے سیکولر انداز کو پسند نہیں کرتے تھے۔

کسی بھی زبان میں تنقید کا ایک مخصوص مقام ہوتا ہے۔ تنقید کا مقصد رد کرنا یا مذمت کرنا نہیں بلکہ کسی بھی ادب پارے میں محاسن وعیوب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بہتر سمت تجویز کرنا ہے۔ جب بھی کسی نظم یا نثر پر کچھ لکھا جاتا ہے تو عموماً اس کی تعریف ہی کی جاتی ہے۔ اس کو تنقید کی بجائے حوصلہ افزائی کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ تنقید کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ جیسے ایک مصور ایک تصویر تخلیق کرتا ہے۔ جب وہ دوسری بار اس کو دیکھتا ہے تو اسے کئی جگہ پر بہتری کی گنجائش محسوس ہوتی ہے۔ وہ اس میں کئی طرح کی تبدیلیاں کرتا ہے کہ دیکھنے والوں کو مزید بھلی لگے۔ اسی طرح ایک فن پارہ جب کسی محقق کے سامنے آتا ہے تو وہ اس سے جہاں محظوظ ہوتا ہے وہاں اسے کہیں کہیں بہتری کی گنجائش بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے وہ تحریر کی کمزوریوں کی نشاندہی کرتا ہے اور بہتری کے لیے اپنی تجاویز بھی دیتا ہے۔ اگر تنقید کے اس پہلو کو مدِ نظر رکھ کر معظمہ نقوی کی تنقید کا جائزہ لیا جائے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ معظمہ کی اس بارے میں تمام پہلوؤں پر گہری نظر ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہی ہیں۔ مثلاً تنقیدی دبستان (ڈاکٹر سلیم اختر) اور آبِ حیات (مولانا محمد حسین آزاد)۔ ان کے مقالے سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں کہ محترمہ نے تنقید کے حوالے سے قدیم یونانی مفکرین کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔

اردو زبان کی تاریخ کا موضوع خاصہ دلچسپ ہے اور معظمہ نے بھی اس پر کسی حد تک روشنی ڈالی ہے۔ اُنھوں نے بالکل صحیح فرمایا کہ زبان کا تعلق تاریخ کے تغیر و تبدل اور ارتقاء سے بہت گہرا ہے۔ بیرونی حملہ آوروں نے ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ سنسکرت ہندوستان کی قدیم زبان ہے لیکن یہ زبان بھی وقت کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتی گئی اور اس کی جگہ ''کھری بولی'' ہندی اور اردو نے لے لی۔ ہندی جو کہ بیرونی الفاظ و محاورات سے خود کو الگ رکھتی تھی اس لیے زیادہ ترقی نہ کر سکی۔ مُغلیہ دور میں دِلی اور حیدر آباد دکن میں ہندو مسلم مشترکہ ثقافت پروان چڑھی اور جس زبان نے ان علاقوں میں پرورش پائی وہ ہندی اور دوسری زبانوں کا مرکب تھی جو ترقی کرتے کرتے پہلے ''کھری بولی'' ہندوستانی اور بعد میں اردو کے قالب میں ڈھلی۔ چونکہ دورِ اسلام میں زیادہ تر حملہ آور عرب، افغان، ایرانی اور مغل تھے اس لیے ان قوموں کی زبانوں نے ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں کو بے حد متاثر کیا اور اس طرح ایک نیا لسانی انقلاب ہندوستان میں آیا۔ ''کھری بولی'' نے ترقی کرتے کرتے اردو کی شکل اختیار کی تو ہندوؤں نے محض اس بنیاد پر کہ اس میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ تھے اسے رد کیا اور ہندی سے الگ زبان قرار دیا۔ اس طرح ہندی اردو ''اندولن'' نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک لسانی دوری سی پیدا کر دی۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے تہذیبی عوامل نے آخر مسلمانوں کو ایک الگ وطن کی طرف مائل کیا۔ معظمہ نے نہایت علمی انداز میں اردو کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے اور وہ گوشے بھی نمایاں کیے ہیں جو بہت سے محققین کی نظروں سے اوجھل تھے۔

اردو نثر کے ارتقائی جائزے کے حوالے سے بھی معظمہ نے بہت پُر مغز مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو نثر میں ابتدا میں مذہب اور تصوف غالب تھا اور وہ بھی تمثیلی قصوں کی شکل میں لیکن فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا کردار اردو کی ترقی میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہاں ابتدائی نصابی کتابیں اور ناول تخلیق ہوئے۔ اس سلسلے میں مصنفہ نے تفصیل

سے روشنی ڈالی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مستشرقین اردو کو ''اینگلو ہر یٹنگل لینگوئج'' کہتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کو اپنے اندر سمونے کی اردو میں حیرت انگیز صلاحیت تھی۔

زبان کے ارتقاء کے حوالے سے معظمہ کی تحقیق بھی اعلیٰ ہے۔ اس حوالے سے میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ اردو پر مقامی زبانوں کے اثرات پر مناسب انداز میں توجہ نہیں دی گئی حالانکہ اردو کا خمیر انھی زبانوں سے اُٹھا ہے۔ مسلمانوں کی برِصغیر میں آمد سے پہلے جو زبانیں یہاں بولی جاتی تھیں ان میں پنجابی (سرائیکی) سب سے نمایاں تھی۔ ڈاکٹر دین محمد تاثیر نے پنجابی کو اردو زبان کی ماں کہا ہے۔ ڈاکٹر عذرا شوذب کے مطابق اردو زبان کی ابتدائی تشکیل میں بابا فرید شکر گنجؒ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ بابا جی پنجابی زبان کے پہلے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا کلام سکھوں کی مقدس کتاب ''گرنتھ صاحب'' میں بانیوں (حمدوں) کی شکل میں آج تک محفوظ ہے۔ بابا فریدؒ کی پیدائش ملتان میں ہوئی۔ اُن کے زمانے میں اردو کا وجود ہی نہیں تھا۔ اُنھوں نے اپنی پنجابی شاعری فارسی رسم الخط میں لکھی۔ اُردو زبان نے اس وقت زیادہ فروغ پایا جب امیر خسرو جیسے تُرکی نژاد شاعر نے اردو میں شاعری تخلیق کی۔ امیر خسرو ابتداء میں خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی منقبت لکھا کرتے تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء (دلی والے) بابا فریدؒ کے مرید تھے۔

امیر خسرو کا اندازِ بیاں آج تک محفوظ ہے۔ سرائیکی زبان (جسے پنجابی کی ابتدائی شکل بھی کہہ سکتے ہیں) بابا فریدؒ کی مادری زبان تھی۔ بابا فریدؒ ملتان کے قریب قصبہ کوٹھے وال میں پیدا ہوئے۔ بابا صاحب کے اجداد افغانستان سے ہجرت کر کے ملتان میں آباد ہوئے۔ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے۔

اردو غزل کے حوالے سے معظمہ کی تحقیق بہت دلچسپ ہے۔ اُن کے مطابق غزل اپنے آغاز کے بعد سے آج تک ہر زمانے میں مقبول رہی ہے۔ حُسن و عشق کے موضوعات کے علاوہ دورِ جدید میں ہر طرح کے مضامین آ گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل اردو زبان کا

جھومر ہے۔ اس کا وجود زمان و مکان سے ماورٰی ہو گیا ہے۔

سر سید احمد خان (جن کا کردار مسلم نشاطِ ثانیہ میں بہت نمایاں ہے) کے سلسلۂ نسب کے حوالے سے معظمہ کی تحقیق بہت ہی دلچسپ ہے۔ اُن کے مطابق سر سید کا سلسلۂ نسب اہلِ تشیع کے نویں امام محمد تقیؑ تک پہنچتا ہے۔ اُن کا ننھیال بھی خاندانِ سادات سے تھا۔ اس طرح وہ نجیب الطرفین سید تھے۔ سر سید کی ولادت کے حوالے سے مولانا الطاف حسین حالی کی تحقیق بہت دلچسپ اور اہم ہے۔ سر سید 17 اکتوبر 1817ء کو دِلی میں پیدا ہوئے۔ سر سید کے مطابق اُن کی والدہ شرک و بدعت سے بہت دُور تھیں۔ وہ ایصالِ ثواب کی قائل تھیں، جنہیں سر سید نہیں مانتے تھے۔ البتہ ان کے خیال میں اگر کوئی شخص کوئی کارِ خیر دُنیا میں چھوڑ جائے تو اُس کا اجر اُسے پہنچتا ہے، سر سید کے بچپن کے حالات بھی حیران کن تھے۔ اُن کے یہ عقائد اہل تشیع اور اُن کے آئمہ کے بالکل برخلاف ہیں کیونکہ اہلِ تشیع کے عقائد میں بیعت اور نذر و نیاز خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ معظمہ کے مطابق غالباً یہی وجہ ہے کہ اُن کو سر سید احمد رضوی کی جگہ سر سید احمد خان لکھا جاتا ہے (لیکن یہ وجہ تسمیہ میرے خیال میں کافی نہیں اور مزید تحقیق کی محتاج ہے)۔ میرے خیال میں معظمہ کا یہ خیال درست اور حقائق پر مبنی ہے کیونکہ سر سید خان شیعہ عقائد پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ الطاف حسین حالی جو کہ ابتدا میں شیعہ تھے اور مرزا غالب کے شاگرد تھے (شاید سر سید کی صحبت کے اثر سے) شیعیت سے نکل گئے۔ حالی کی نظم مسدس حالی میں شیعہ عقائد پر تنقید بہت واضح ہے۔ اسی مسدس کے بارے میں سر سید نے کہا تھا کہ قیامت کے دن اگر خدا مجھ سے پوچھے کہ دنیا میں کون سا اچھا کام کیا تو میں کہوں گا کہ میں نے حالی سے مسدس حالی لکھوائی۔

"میں کیوں لکھتی ہوں۔۔۔؟" یہ سوال شاید معظمہ نے خود سے کیا ہے اور خود ہی اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مطابق وہ خود کو ادب کے سمندر میں ضم کرنا

چاہتی ہیں یعنی وہ صلہ و ستائش سے بے پرواہ ہو کر ادب میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتی ہیں۔ یہ عجیب خواہش ہے۔ ہماری مادی دنیا میں اس خواہش کے علمبردار اہل قلم وجود نہیں رکھتے۔ میاں محمد بخش کہتے ہیں:

سخن شناس محمد بخشا لعلاں دے ونجارے

ترجمہ: "اے محمد سخن کو سمجھنے والے مال و دولت کے پجاری ہیں"۔

مجھے ڈیرہ غازی خان کے ادبی ماحول کا زیادہ علم نہیں لیکن ملتان میں مجھے نور احمد غازی کے علاوہ ایک بھی مصنف ایسا نہیں ملا جو مال و دولت کی طمع کے بغیر ادب تخلیق کر رہا ہو۔ معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی ایک جگہ لکھتے ہیں:

"کیا ہمارے معاشرے کو علم و دانش کی ضرورت ہے یا نہیں ...... پاکستان میں ایسے لکھنے والے ناپید ہیں کہ جو لکھنے کو اپنا پیشہ بنائیں اور معاشرے میں ایک باعزت زندگی گزار سکیں۔ اس لیے کوئی اگر لکھتا ہے تو ان کے لیے لکھتا ہے جو اسے روزی مہیا کرتے ہیں یا معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ اگر معاشرے کو مصنف کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اس کی کتابیں خریدتا ہے اور جتنی کتابیں لوگ خریدتے ہیں اسی سے مصنف کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے لیکن اگر معاشرہ اسے فراموش کر دے یا اس کی پرواہ نہ کرے تو اس کے لیے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا تو اپنی تحریروں کو فروخت کر دے یا اپنی آزادی کھو دے اور لکھنا چھوڑ دے"۔ (تاریخ اور معاشرہ)

ملتان کے ماحول میں مختلف ادبی تنظیمیں کام کر رہی ہیں جن کا مقصد فروغ ادب بالکل نہیں بلکہ وہ ادب کے نام پر صاحب ثروت لوگوں سے سکوں کا حصول چاہتی ہیں۔ اس سے ان تنظیموں کو تو شاید فائدہ ہو لیکن تخلیق کار غربت کی پستیوں میں گرتا چلا جاتا ہے۔ میں نے اپنی ادبی زندگی میں بہت سے اہل ادب کو کسمپرسی کی حالت میں مرتے دیکھا ہے۔ غالباً اسی لیے اقبال ارشد مرنے سے پہلے کہہ گئے:

ہم اہلِ درد جہاں سے گزر گئے چپ چاپ

"قتلِ عمد" کے زیرِ عنوان معظمہ زچہ بچہ کلینک کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ انھوں نے جو حالات بیان کئے ہیں ان کا میں بھی عینی شاہد ہوں۔ میں نے 35 سال مختلف ہسپتالوں میں کام کیا ہے۔ میرا تعلق لیبارٹری کے شعبے سے ہے۔ گو میں براہِ راست مریضوں کے علاج معالجے میں شامل نہیں رہا لیکن بہت سے واقعات میری آنکھوں کے سامنے ہوئے اور کئی مرتبہ مجھے ان کا انکوائری افسر بھی مقرر کیا گیا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک خبر اخباروں میں گردش کررہی ہے کہ نشتر ہسپتال ملتان کی چھت پر بہت سی لاوارث لاشیں ملی ہیں جنہیں کھلے آسمان تلے کوؤں اور چیلوں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ میں اس ماحول سے اتنا بدظن تھا کہ میرے اور میڈیکل ڈاکٹرز کے درمیان شدید اختلافات رہے۔ ڈاکٹرز نے ہر ممکن کوشش کی کہ مجھے کسی دفتری معاملے میں الجھا کر سزا دلوائی جائے لیکن ان کی کوئی چال کامیاب نہ ہوئی کیونکہ میرا دامن صاف تھا۔ میری ریٹائرمنٹ پر میں نے الوداعی تقریب میں شرکت سے بھی انکار کردیا۔ مینار کینسر ہسپتال میں (جو نشتر ہسپتال کے اندر ہی واقع ہے) میری ملازمت تھی۔ میں اس ادارے کا ڈائریکٹر بھی رہا لیکن چونکہ میں ایک سائنسدان تھا اس لیے ڈاکٹروں کے پیشہ ورانہ تعصب کا ہمیشہ شکار رہا۔ اس ہسپتال میں اتنے غیر اخلاقی جرائم ہوئے کہ اگر ان کو ضبطِ تحریر میں لاؤں تو کئی کتابیں لکھ سکتا ہوں لیکن مجھے شرم آتی ہے اپنے ہی ادارے کے خلاف لکھتے ہوئے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس پر لکھنے سے کچھ بہتری کی اُمید بھی نہیں تھی کیونکہ اوپر سے نیچے تک آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے اور سسٹم کو سدھارنا بہت ہی مشکل محسوس ہوتا ہے۔ (تمام بااختیار حلقے اس صورتِ حال سے واقف ہیں لیکن کسی کو توفیق نہیں کہ اس سسٹم کو درست کرسکیں)۔

امام حسینؑ کی شہادت نے جتنا تاریخِ انسانیت کو متاثر کیا ہے کسی اور واقعہ نے نہیں کیا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کس طرح ایک عالمگیر مذہب کے ماننے والے اتنے شقی القلب

ہو گئے کہ یہ بھی بھول گئے کہ خود ان کے رسولؐ نے جس گلے کو بوسے دیئے اس کو نہایت ہی بے دردی سے انہوں نے کاٹ ڈالا۔ اس واقعہ کے کیا تاریخی محرکات ہو سکتے ہیں؟ بہت سے حقائق پر اب تک پردہ پڑا ہوا ہے کیونکہ اسلام کی ابتدائی تاریخ لکھی ہوئی شکل میں وجود نہیں رکھتی۔ ہمارے اندر جو نظریات رواج پا گئے ہیں ان کی بنیاد زیادہ تر وہ روایات ہیں جو مختلف مکاتبِ فکر میں (دورِ ملوکیت میں) عام ہوئیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم نظر آتی ہے کہ اسلام کے ابتدائی دَور میں ہی بہت سے مسلمان اسلامی تعلیمات اور فرامینِ رسولؐ سے دور ہو گئے تھے اور صوم وصلوٰۃ نے محض رسوم کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس ماحول میں خالقِ کائنات نے نہ صرف سنتِ ابراہیمی کو زندہ کیا بلکہ اس کی تکمیل کی۔ اسی لیے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

بہت ہی سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

بے شک اس واقعہ سے انسان بیدار ہوا لیکن دلگیر بھی ہوا اور اسی لیے امتِ مسلمہ میں گریہ وماتم جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں شہادتِ حسینؑ کا غم ہی انسان کو ظالم بننے سے روکے گا۔ یزیدیت ایک نہ ایک دن مکمل طور پر دم توڑے گی معظمہ نے اس موضوع پر بہت ہی چشم کشا تحریر قارئین کے مطالعے کے لیے چھوڑی ہے۔ اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ:

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

''سستی شہرت'' کے عنوان سے معظمہ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شعراء اور ادباء تخلیقی معیار کی طرف توجہ نہیں دیتے بلکہ سستی شہرت کی طرف بھاگتے ہیں۔ بہت کم لوگ ڈھنگ کا کام کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی اکثر تحریریں قوتِ اصلاح سے خالی ہیں

اور وہ انسانی سماج میں کوئی بہتری نہیں لا سکتیں۔ تخلیق کاروں کو اس طرف توجہ دینی چاہیے اور صلہ وستائش کی پرواہ کیے بغیر معاشرتی برائیوں کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔

گزشتہ سال کا سب سے بڑا عذاب کرونا کی بیماری تھی جس سے کروڑوں انسان موت کا شکار ہوئے۔ بہت سے ملکوں کی معیشتیں ڈوب گئیں۔ اس وباء نے جہاں پوری دنیا کو معاشی اور جانی نقصان پہنچایا وہاں تخلیق کاروں کو بھی کرب میں مبتلا کیا اور اُنھوں نے ایسی تحریریں چھوڑی ہیں جنھوں نے اہلِ درد کو پہروں رلایا ہے۔ بہت سے ناول، افسانے غزلیں، نظمیں اس موضوع پر منظرِ عام میں آئیں۔ معظمہ نے ان سب کا اپنے مقالے میں احاطہ کیا ہے۔

بابِ سوم میں جنوبی پنجاب کے تخلیق کاروں کی تخلیقات پر تبصرے کیے گئے ہیں۔ معظمہ کا اسلوب معروضی ہے۔ وہ اپنی طرف سے بہت کم کہتی ہیں اور اپنے تاثر کے سلسلے میں مصنف کی تحریر سے ثبوت تلاش کر کے اپنی رائے متعین کرتی ہیں اور قارئین کے سامنے رکھتی ہیں۔

معظمہ کی کتاب کئی لحاظ سے اعلیٰ ہے اور تحقیق کے طالب علموں کے لیے مفید ہے۔

اللہ کرے حُسنِ رقم اور زیادہ

☆☆☆

معظمہ نقوی کی نثر ایک جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر سید ضمیر بخاری (میانوالی)

معظمہ نقوی خانوادۂ سادات کے علمی گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ قلم سے اس گھرانے کا رشتہ بڑا قدیمی ہے۔ معظمہ نقوی اردو کے غیر معمولی لکھنے والوں میں سے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب بہ عنوان "نوائے نقوی" تنقیدی، تجزیاتی اور تاثراتی نگارشات کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ اس میں مختلف موضوعات پر الگ الگ عنوانات کے تحت تین ابواب تحقیقی مضامین، ادبی کالم، تبصرہ جات شامل ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان مضامین میں متذکرہ شخصیات کی فکری و فنی حیات کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ ان مضامین میں مصنفہ نے بہت حد تک موضوعات سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

تحقیقی مضامین میں اردو تنقید کا پسِ منظر، اردو زبان تاریخ کے آئینے میں، نثر کا ارتقائی جائزہ، اردو غزل کا ارتقا بڑی اہمیت کے حامل مضامین ہیں۔ اس طرح ادبی کالموں میں ادب کی خستہ حالی، کرونائی دور اور ادب خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ تبصرہ نگاری میں انہوں نے ایک کہکشانِ ادب سجائی ہے۔ جس میں تنقیدی پہلو قابلِ تعریف ہے۔

اسلوبِ نثر میں معظمہ نقوی سادہ، سلیس اور رواں نثر کا پیرائیہ اظہار بیان کرتی ہیں۔ ان لوگوں کے برعکس ہیں جو آسان کو بھی مشکل بنا دیتے ہیں۔ زبان و بیان دونوں شگفتہ اور دلکش ہیں۔ عام فہم انداز و اسلوب کی سادگی قاری کو متاثر کرتی ہے۔ تمام مضامین نہ صرف اسلوب قلم بلکہ اندازِ تنقید و حسنِ تعارف کا بہترین نمونہ ہیں۔

معظمہ نقوی قابلِ تہنیت ہیں جو اس کام کو بہ حُسن وخوبی نبھانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ ''نوائے نقوی'' میں ایک کہکشاں دکھائی دیتی ہے جو اس خطہ کی بہت سی نامور ہستیوں کی لفظی تصویر بنانے میں بہت حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔ تجسیم نگاری میں انہیں ایک خاص دسترس حاصل ہے۔ ''نوائے نقوی'' کے مضامین تحقیقی، تنقیدی، تجرباتی وتاثراتی فضا میں دنیائے ادب کا ایک جہاں جگمگاتا دکھائی دیتا ہے۔ ''نوائے نقوی'' ادبی حلقوں میں ضرور پذیرائی حاصل کرے گی اور اربابِ علم وفضل کی نظروں میں اعتبار حاصل کرے گی۔

☆☆☆

معظّمہ نقوی کی نثر نگاری

مظفر احمد مظفر

(حال مقیم لندن)

اردو نثر نگاری Prose Writing میں سب سے پہلے سادہ نویسی کے علمبردار بادشاہ شاہ عالم ثانی کو مانا جاتا ہے۔ جن کی تصنیف "عجائب القصص" سادہ نویسی میں اردو نثر کی پہلی کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ آپ نابینا ہونے کے باعث صرف املاء کروا کر مدعا نگاری کرتے تھے۔ اس کے بعد میر امن کی کتاب "باغ و بہار" کا بہت شہرہ رہا۔

امام احمد رضا خان صاحب دامت برکاتہم کی ولادت 1856ء میں ہوئی آپ نے 14 برس کی عمر سے نثری میدان میں قدم رکھ دیا تھا اور پہلی تصنیف "معیر الطالب فی شیون ابی طالب" مکمل کی۔ اس کے بعد دوسری تصنیف "مرتجی الاجابات لدعاء الاموات" تھی۔ یہ دونوں کتب شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکیں۔ امام احمد رضا خان فاضلِ بریلوی کی اردو تصانیف ابھی تک حیطہ شمار میں نہیں آسکی ہیں یہ بلاشبہ سینکڑوں میں ہیں اور ہزار ہا صفحات پر محیط ہیں۔ اس میں شبہ باقی نہیں ہے کہ اردو کی جدید علمی نثر کے فروغ کا کام سر سید احمد خان اور امام احمد رضا خان نے ہی کیا لیکن اس بارے میں ایک کا نام مشہور ہو گیا اور دوسرے کا مستور رہ گیا۔

اس سلسلہ میں افتخار احمد قادری برکاتی لکھتے ہیں کہ "سر سید احمد خان نے بھی بہت لکھا۔ حالی، شبلی، نذیر احمد اور سر سید کے دوسرے رفقاء نے بھی بہت لکھا، ان کے ہم عصروں میں

منشی محمد حسین آزاد بھی ان سے پیچھے نہ رہے بلکہ ان چند مصنفین کی تصانیف بھی امام احمد رضا کی تصانیف کے برابر نہیں ہوتیں۔ اس لیے اگر صفحات کی تعداد کو بھی دیکھا جائے تب بھی امام احمد رضا خان فاضلِ بریلوی کا نمبر سرسید احمد خان سے اوپر رہتا ہے۔"

عبدالباری قاسمی ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "سرسید نے مغرب کی ایک مشہور اور مقبول صنف Essay سے متاثر ہو کر مضمون نگاری کی بنیاد رکھی، سرسید مغرب کے مشہور مصنفین ایڈیسن، ڈرائڈن اور بیکن وغیرہ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے ان حضرات کے بہت سے مضامین کو ہی اردو کا لبادہ اوڑھا کر پیش کیا اور ان کے اسلوب کو اپناتے ہوئے بہت سے مضامین قلمبند کیے۔"

نثر نگاری میں مولانا الطاف حسین حالی مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی جدید اردو ادب بالخصوص جدید اردو شاعری کے معمار ہیں۔ آپ نے نثر اور نظم ہر دو محاذ پر دیرپا اور غیر معمولی اثرات چھوڑے ہیں۔ خصوصاً تحریک علی گڑھ کے خیالات و رجحانات کو پھیلانے اور استحکام دینے میں مولانا پیش پیش رہے۔ نثر اور نظم میں ان کی ہر تصنیف جدید اردو ادب کے ارتقاء میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ حالی کی شاعری جدید انداز سادگی و پرکاری نئے فطری اور اصلاحی موضوعات کے باعث اہم مانی جاتی ہے۔ بہرکیف اس تناظر میں سرسید اور خصوصاً ابوالکلام آزاد کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ہر دو افراد نے مدعا نگاری اور استدلالی نثر کی بنیاد ڈالی۔ ان کی تحاریر میں تہہ داری، تبلیغی و اسلامی جوش، ندرت فکر، مفکرانہ سنجیدگی، اصلاحی جذبہ اور خطیبانہ و ناصحانہ انداز تا حد کمال دیکھا جا سکتا ہے۔ سرسید سے قبل نثر مقفی، نثر مسجع، نثر رنگین، نثر پر تصنع اور پر تکلف نثر لکھنے کا رواج تھا اور ایسے ہی مرصع راقم کو باکمال انشا پرداز مانا جاتا تھا۔

اگرچہ میر امن اور دوسرے قلمکاروں نے بھی ان سے قبل سادگی اور سلاست کو اپنایا تھا مگر یہ صاحبانِ قلم روزمرہ کے معمولات اور وقتی شہرت تک ہی منحصر اور محدود رہے، سرسید

نے مغربی مصنف ایڈیسن سے متاثر ہو کر جدید سائینٹیفک طرز تحریر کی بنیاد رکھی تھی جو قبول عام پا گئی۔ فکر انگیزی اور خصوصاً محاکات نگاری Simulation استعارے Metaphors، تشبیہات اور عام بول چال کے محاوروں کو یوں نثر میں شامل کرتے ہیں کہ گویا نثر پڑھتے شعر کا لطف آنے لگتا ہے۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ نثر کے تمام فقروں میں وزن پیدا کرنے کے لیے الفاظ کی ترتیب میں الٹ پھیر کر دیا جاتا ہے۔ ایک مثال اس طرح دی جاتی ہے کہ ''قامت موزوں کے روبرو سرو رواں ناچیز ہے اور کاکل پیچاں کے سامنے مشک ختن بے قدر ہے۔'' بعض حضرات کے نزدیک نثر مقفیٰ اور نثر مسجع ہم معنی اصلاحات ہیں لیکن بعض علمائے ادب نثر مسجع کو نثر مقفیٰ سے مختلف جانتے ہیں۔

مشہور سکالر غلام مصطفیٰ اشرفی نے کیا خوب کہا تھا کہ ''صحافی ہو یا ادیب دونوں اپنا مواد اردگرد پھیلی ہوئی زندگی سے لیتے ہیں۔ صحافی اس مضمون کو بغیر رنگ آمیزی کے بیان کر دیتا ہے مگر ادیب چونکہ حسن کار ہوتا ہے، ساتھ ہی جمالیاتی منطقوں تک اس کی رسائی ممکن ہوتی ہے اس لیے وہ جمالیاتی پہلوؤں کو بہترین اسلوب کے ساتھ پیش کرتا ہے۔''

القصہ جدید نثر کے علمبرداروں میں ابوالکلام آزاد کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اس حوالے سے چراغ حسن حسرت خود لکھتے ہیں کہ

''مجھے نثر نگاروں میں ابوالکلام کے سوا کسی کا انداز جچا نہیں تھا۔''

حسرت کا مولانا ابوالکلام کے حوالے سے یہ شعر بھی ملاحظہ ہو کہ:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہیں رہا

نثر کے لغوی معنی بکھری ہوئی شئے کے ہیں جو تحریر منظوم نہ ہو بلکہ عام گفتگو کی طرح لکھی جائے اسے نثر کہتے ہیں۔

نثر ایک ایسی اصطلاح ہے جس میں مصنف، ادیب یا لکھاری بغیر کسی موزوں صنعت

کے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اردو ادب کی بنیاد شاعری اور نثر پر ہے۔

ہر نثر میں چار طرح کے اوصاف ہوتے ہیں۔

عالمانہ، عارفانہ، شاعرانہ، منشیانہ معنی کے اعتبار سے نثر کی دو قسمیں ہیں۔

دقیق اور سلیس

پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔

ہمارے معاصرین میں جہاں بہت سے صاحبانِ کمال نثر نگاری کے میدان میں غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ وہیں ایک معتبر نام افسانہ نگار، کالم نویس، تبصرہ نگار و شاعرہ محترمہ معظمہ نقوی کا ہے۔ میرے پیش نظر "نوائے نقوی" کی صورت میں آپ کی نثری تخلیقات کا دل پذیر مجموعہ فردوس نظر ہے۔

آپ کی تحاریر میں قدرتی طور پر غیر معمولی سنجیدگی، متانت، سلاست، بلند درجہ فصاحت روانی، سلاست اور سادگی کارفرما ہے۔ آپ سادگی مگر قدرے پرکاری سے یوں مضمون کو الفاظ کا جامہ پہناتی ہیں کہ قاری بقدر بادام بھی بوجھل پن اور اُلجھن نہیں محسوس کرتا، مشمولات تصنیف میں، اقبالؒ اور تعلیم، اردو تنقید کا مختصر پس منظر، اردو زبان تاریخ کے آئینے میں، سر سید احمد خانؒ کیا سید تھے، معرفت عشق اور سستی شہرت خصوصاً در خور تحسین ہیں۔ جس سے آپ کی خداداد نثری صلاحیتوں کا ثبوت ملتا ہے۔

تحریر میں برجستگی و شستگی آپ کا خاصہ ہے۔ دوسری طرف مدعا نگاری Accuation نے آپ کی تحاریر میں سحر انگیزی کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے یعنی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مقصدیت آپ کی گھٹیوں میں پیوست ہے۔ استہزاء اور بھکڑ پن کی علامات سے آپ کا دور بھی علاقہ نہیں بلکہ رشحات میں غور و فکر اور متانت و سنجیدگی کا عنصر وافر پایا جاتا ہے۔ صداقت، اثر آفرینی درد و اثر اور صداقت بھی معظمہ کی تحریروں کا خاص قابل تحسین حصہ ہے۔

معظمہ کنایات و استعارات و تشبیہات اور دیگر فنی لوازمات کو بروئے کار لا کر اپنے مافی

الضمیر Conscience کو سچائی کے ساتھ پیش کرتی ہیں اور یہی وصف ان کی اثر آفرینی اور دردانگیزی کی وجہ بنتا ہے کہ دل سے بات نکلتی ہے اور دل پر اثر انداز ہی نہیں، بلکہ قلب ونظر کو فریفتہ بھی کرتی ہے، ساتھ ہی تعقل پسندی واستدلال Rationalism کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ معظمہ نے اپنے معاصرین مضمون نگاروں، ادیبوں اور شعراء کو متاثر کیا ہے۔

تاریخ، فلسفہ، اخلاق، مذہب اور سیرت وغیرہ مختلف مضامین پر متنوع اسلوب اپنا کر مضامین لکھے ہیں جنھیں عوام وخواص میں قبول عام ملا ہے۔

نثر میں موضوع کے ساتھ ساتھ جب اسلوب Procedure or Style بھی کارفرما ہو جاتا ہے تو اس میں از خود ادبیت شامل ہو جاتی ہے کیونکہ اسلوب ہی درحقیقت کسی خیال یا موضوع کو ادب کے دائرے میں داخل کرتا ہے۔

نثری مواد میں اسلوب ادائے خیالات ہوتا ہے جس سے مراد مصنف کے ذہنی ارتقاء و رجحان کا قاری کے ذہن میں منتقل ہو جانا ہے۔ معظمہ کی نثری تحریروں میں ان کی کشش فکر اور ان کے بہترین اسلوب کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

اخباری کالم، سوانح، تاریخی مضامین، تاریخ نگاری، خاکہ نویسی ہو یا مطائبات وفکاہات ان سب میں ان کا مخصوص طرز تحریر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے قارئین آپ کے دل آویز اسلوب سے حد درجہ متاثر ہیں۔ معظمہ نثر کی ہر صنف میں قدرت رکھتی ہیں۔ آپ کی متاع نثر مختلف النوع موضوعات پر مشتمل ہے۔ الغرض متین وسنجیدہ، خالص نثر جس میں قرطاس بھی فخر کرتا ہے آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے علاوہ فکاہی مضامین، خاکہ نویسی، تراجم دیباچے، تنقیدات، تبصرے اور تحقیقی مضامین وغیرہ آپ کی نثری تحریروں کی مختلف صورتیں ہیں جن پر بلاشبہ آپ ناز کر سکتی ہیں۔ آپ کے کالم صرف شعور خوب و زشت ہی نہیں بلکہ ذہن کی بالیدگی اور طراوت فکر کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ معظمہ نقوی اپنے گرد وپیش کے ماحول اور مقامی موضوعات کو اپنے کالموں میں منفرد انداز میں بیان کرتی

ہیں۔ان کے نوک قلم سے فکر آمیز تحریروں کا ایک گراں قدر ذخیرہ نکلتا ہے۔معظمہ کا اگرچہ نثری وشعری سرمایہ زیادہ نہیں پھر بھی جو کچھ حاصل ہوا کمیت میں نہ سہی مگر کیفیت میں بڑا ہمہ گیر اور اثر انگیز ہے۔

تخلیقی انشا پردازی کی ایک خوبی حُسنِ تحریر ہے۔تخلیقی نثر لکھتے ہوئے کچھ ادیب ابہام یا ایہام کا شکار ہو جاتے ہیں جو معیار ابلاغ کو مجروح کرتا ہے لیکن معظمہ کی نگارشات ایسے معائب سے پاک ہیں۔یہ خوبی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

آپ غیر مبہم سلیس، رواں اور دلکش الفاظ سے مزین نثر ایجاد کرتی ہیں۔ان کا انداز اگرچہ شاعرانہ اور حکیمانہ ہے مگر آپ قافیہ پیمائی اور مشکل پسندی سے گریز کرتی ہیں، کسی بھی طرح کی خودنمائی یا نرگسیت کا مشاہدہ آپ کا وطیرہ نہیں ہے۔وہ ہر مقام پر شامل بھی ہیں مگر اس انداز میں کہ کبھی منظر نامے سے الگ بھی نظر آتی ہیں اور کہیں تو خود منظر بھی خود ناظر بھی اور کہیں کہیں خود نظارہ بھی ہیں۔تحریر کی یہی خوبی قاری کے جذبات میں ہیجان اور ایک طرح کا مدوجزر پیدا کرتی ہے۔دھیمہ پن اور ادائے شائستگی کا خیال ان کی تحاریر کے ایسے اوصاف ہیں جو انہیں اپنے معاصر انشاء پردازی سے قدآور بناتے ہیں۔

☆☆☆

معظمّہ نقوی کی ''نوائے نقوی''

سید مبارک علی شمسی

معظمہ نقوی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ ان پر شروع سے ہی شہرت کی دیوی فریفتہ ہے۔ ان کا نام اور ان کا منفرد کام ہی ان کے ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ ان کا تعلق قادرالکلام شاعر حضرتِ محسن نقویؒ شہید کے شہر ڈیرہ غازی خان سے ہے۔ وہ خانوادۂ سادات کی ایک خوبصورت کلی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب اور اسلام کی جانب ان کا رجحان زیادہ ہے۔ وہ مادیت پرستی کے شکار معاشرہ کو حقارت کے سپرد کر کے اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے اور حرص ولالچ سے پاک وپاکیزہ تعلقات بنانا پسند فرماتی ہیں۔ ان کا شمار عہدِ حاضر کی مایہ ناز خواتین لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک عرصہ سے علم وادب کی خدمت کر رہی ہیں۔ اُنھیں نظم ونثر دونوں میں نمایاں مقام حاصل ہے اور وہ وطنِ عزیز پاکستان کے نسائی ادب میں اک خوبصورت اضافہ ہیں۔ اُنھیں قومی زبان اردو سمیت ماں بولی سرائیکی میں بھی سخن وری کا ملکہ حاصل ہے۔ زیرِ نظر کتاب ''نوائے نقوی'' ان کے مضامین وکالمز اور تبصروں پر مشتمل ایک مجموعہ ہے جس میں انہوں نے کہنہ مشق شعرائے کرام اور قومی ہیروز سمیت ملکی وبین الاقوامی مشاہیرِ ادب کی کتب پر تبصرہ جات شامل کر کے اُنھیں اردو ادب کی تاریخ کا حصہ بنادیا ہے۔ اس سے قبل وہ ایک شعری انتخاب ''کف دست'' اور ایک سلام کا انتخاب ''مودت نامہ'' اربابِ علم ودانش کی نذر کر کے خاصی پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں معاشرتی بگاڑ اور معاشرتی ناہمواریوں سمیت علاقائی مسائل کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ صنفِ نازک کو درپیش چیلنجز اور ان کی محرومیوں اور مجبوریوں کو بھی اپنا ذریعہ اظہار بناتی ہیں۔

میں دُعا گو ہوں کہ خلاقِ عالم ان کو صحت وسلامتی والی زندگی عطا کرے اور ان کا تخلیقی سفر اسی عزم کے ساتھ ہمیشہ جاری وساری رہے۔۔۔ (آمین)

☆☆☆

حسرت کا شاعر۔۔۔ شفقت کاظمی

جنوبی پنجاب کے شہر ڈیرہ غازی خان کی سرزمین ادب کے حوالے سے نہایت زرخیز ہے۔ اس سرزمین نے نامور قلمکار تخلیق کیے جو کہ بین الاقوامی سطح پر نہ صرف اپنے ملک کی پہچان کا حوالہ بنے بلکہ ان کے شہر کو بھی انہی کے نام وکام سے جانا جاتا ہے۔ان بے شمار اور نامور ستاروں کی کہکشاں میں جو ہستی مثلِ قمر بن کر ابھری وہ سید فضل الحسن رضوی المعروف شفقت کاظمی کی تھی۔آپ کی شخصیت کے کچھ ذاتی سماجی، فنی وفکری پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کریں گے۔جس ہستی نے محسن نقوی جیسے گراں قدر شاگرد کو تخلیق کیا اور جسے رئیس المتغزلین نے اپنا شاگرد و جانشین مقرر کیا وہ بھلا کوئی عام ہستی ہوگی؟ آپ کے فن وشخصیت پہ اب تک چار ایم۔فل کے تحقیقی مقالہ جات کئی یونیورسٹیوں سے ہو چکے ہیں۔آپ پر پہلا ایم۔فل کا مقالہ مسز انیس فاطمہ نے بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے کیا جبکہ ڈاکٹریٹ کی سطح پر آپ پہ اب تک ایک ریسرچ ورک ہوا مگر تا حال تشنگی باقی ہے کیونکہ ایک مخصوص طبقہ کے افراد ہی اس کام سے مستفید ہو سکتے ہیں۔میری اس ناتواں کاوش سے پہلے ڈی۔جی۔خان کے نواحی علاقہ سے تعلق رکھنے والے ادیب وشاعر دلبر حسین مولائی نے اپنی کتاب وسیبی سخنور (تذکرۃ الشعراء 2008ء) میں آپکی فکری وفنی کاوشوں کو اجاگر کرنے کی بھرپور سعی کی۔

آپ 14 فروری 1914ء کو ڈیرہ غازی خان شہر بلاک نمبر 46 میں اپنے آبائی گھر میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا اسمِ گرامی سید سید علی جبکہ آپ کی والدہ محترمہ کا نام سیدہ بی بی تھا۔آپ نجیب الطرفین سید تھے آپ کا شجرہء نسب گلدستہ امامت کے آٹھویں تاجدار گل امام علی الرضاء سے ملتا ہے آپ کا ایک بھائی اور ایک بہن سیدہ مراد بی بی تھیں۔آپ کی مادری زبان سرائیکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں آپ نے سرائیکی زبان میں شاعری کی۔گھر کا ماحول سادہ اور مذہبی تھا۔ آپ کے والد ۱۲۔۳۰ روپے ماہوار پنشن لیتے آپکی والدہ گھر پہ سلائی، کڑھائی کر کے کچھ رقم جوڑ لیتیں جس سے گھر کا گزر بسر اچھا ہو جاتا۔آپ نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور ذاتی طور پر فارسی و اردو ادب کا مطالعہ کیا۔آپ کو بے شمار اشعار زبانی یاد تھے۔جو آپ کے ادب سے گہرے

کم عمری میں آپ مرگی کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور بارہ سال کے طویل عرصے کے بعد مسلسل دوا اور دعا کے بعد آپ کو اس مرض سے مکمل شفاء ملی۔ پیشے کیا عتبار سے آپ مقامی میونسپل کمیٹی میں بطور چپڑاسی بھرتی ہو گئے ترقی کر کے محرر چنگی اور پھر ریکارڈ کیپر تعینات ہوئے۔ مگر کچھ وجوہات کی بناء پر اپنی مقررہ معیاد سے تین سال قبل پنشن لے لی۔ آپ کی ازدواجی زندگی میں آپ کی ایک زوجہ جو رشتہ میں آپ کی چچازاد سیدہ سکینہ بی بی تھیں۔ جن کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ بڑے بیٹے سید مجیب الحسن رضوی اور چھوٹے بیٹے سید نجیب الحسن رضوی تھے۔ آپ کے بڑے بیٹے کمسنی ہی میں وفات پا گئے جبکہ دوسرے بیٹے نے آپ کے بعد آپ کے ادھورے کام کو حالتِ دوام بخشی مگر آپ کا سلسلہ نسل آگے نہ بڑھا سکے آپ کی طبعیت نہایت سادہ اور متوسط تھی۔ آپ کم گو اور سادہ لباس زیبِ تن فرماتے۔ جناح کیپ پہنتے۔ سادہ خوراک و پرہیزی غذا کا استعمال کرتے۔ فنی زندگی کا آغاز آپ نے ۱۸ سال کی عمر سے کیا۔ آپ نے اس سلسلے میں ندیم جعفری سے رجوع کیا جو کہ ڈی۔ جی۔ خان کے بڑے شعراء میں سے تھے انہوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ مولانا حسرت موہانی سے اس حوالے سے رابطہ کریں کیونکہ آپ دونوں کے کلام میں بہت حد تک مطابقت و مماثلت تھی۔ چنانچہ آپ نے اس حوالے سے مولانا حسرت موہانی سے رجوع کیا تو انہوں نے آپ کو اپنا شاگرد بنانے سے صاف انکار کر دیا لیکن آپ نے ہمت نہ ہاری اور سچی لگن سے ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اک غزل ان کی زمین میں ہی لکھ کر آپ نے انہیں بھیجیں جسے پڑھتے ہی انہوں نے آپ کو برملا اپنا شاگرد و جانشین قبول کیا اور اس غزل کو اپنے پرچہ "اردوئے معلیٰ" میں نہ صرف شائع کیا بلکہ آپ کے نام کے ساتھ شاگرد و جانشین حسرت موہانی لکھا۔ یہ اعزاز آپ کے لئے کسی گولڈ میڈل یا ستارہ امتیاز سے کم نہ تھا اور آپ وہ واحد ہستی ہیں جن کو رئیس المتغزلین کا شاگرد ہونے کے ساتھ جانشین ہونے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد آپ کا کلام یکے بعد دیگرے نہ صرف ان کے رسالے میں چھپتا رہا بلکہ تمام برصغیر کے اہم ترین ادبی جریدوں میں شائع ہوا جن میں سے کچھ اہم نام یہ ہیں سیارہ، اقدام، سیپ، اُردو ادب، آئین، نادان، پگڈنڈی، نقوش، نگار، ساقی، قندیل، فانوس، تہذیب الاخلاق، جام نو، شہباز، امروز، نفرت، آفاق، ادب لطیف، الحمراء، فاران اور نیرنگِ خیال شامل ہیں۔ آپ نے خود کو ہمیشہ "خاکپائے حسرت" لکھا اور کہلوایا اور

اپنے ہر دیوان کا نام حسرت ہی پہ رکھ کر اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار فرمایا۔ شفقت کاظمی نے جس دور میں قلم اٹھایا اس وقت پورے برِ صغیر میں اردو غزل کی دھوم مچی تھی۔ وہ اصغر گونڈوی، صفی لکھنوی اور جگر مراد آبادی جیسے شعراء کا زمانہ تھا شفقت نے جنوب مغرب میں بیٹھ کر اپنی اردو غزل کا لوہا منوایا۔ اس حوالے سے ماہر القادری فرماتے ہیں کہ:

''شفقت نے حسرت کے اسلوب کو غزل میں جس طرح نبھایا اور ان کے رنگ کو قائم رکھا بس وہ انہی کا حصہ ہے۔''

حسرت کو رئیس المتغزلین کہا جاتا ہے جبکہ شفقت امام المتغزلین ٹھہرے اور کیوں نہ ہوں سید الاحرار کا جانشین ہونا کسی عام ہستی کے بس کی بات نہ تھی وہ ہستی سید الاسرار ہی ہو سکتی تھی۔ تحقیق میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ آپ کی شریکِ سفر آپ سے بہت جلد بچھڑ گئیں۔ ان کے داغ مفارقت نے آپ کا قرطاس وقلم سے رشتہ مضبوط کر دیا۔ آپ نے اپنے کرب کو خواہ وہ عشقِ حقیقی میں ملایا مجازی میں ہر زخم کو سخن کی مرہم لگائی۔ تبھی تو وہ برملا کہہ اٹھتے ہیں کہ:

مارا ہوا ہوں وعدہ بے اعتبار کا
چسکا سا پڑ گیا ہے تیرے انتظار کا

نہ رہا اس سے واسطہ شفقت
سلسلہ ختم ہے کہانی کا

ہم نے اک دیا جلایا تھا
جانے اسے کیوں بجھایا تھا

جنوبی پنجاب کے آپ وہ پہلے غزل گو شاعر ہیں جن کی غزل صاف اور شائستہ زبان میں ہے۔ آپ نے ہمیشہ آسان بحر میں شاعری کی۔ عشقِ ولایت ومحبتِ اہل بیت (علیہم السلام) کے حوالے سے آپ کا مناقب وسلام کا ایک ضخیم ذخیرہ موجود تھا۔ آپ کی مجازی شاعری میں نغمیت، موسیقیت، معنی آفرینی، جدت، تشبیہات واستعارات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ آپ ایک سچے محب وطن شہری تھے۔ اپنی مٹی سے وفا آپ کے بدن میں لہو بن کر

دوڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں ملی نغمے اور مجاہدین وطن کو خراجِ عقیدت و تحسین اور سلام بھی ملتے ہیں۔

نمونہ کے چند اشعار:

اے ارضِ وطن کے پاسبانو
بے باک و دلیر نوجوانو

آ گئے ساعت جہاد فی سبیل اللہ کی
اب خبر لینا ہے تم کو دشمن بد خواہ کی

اسی طرح ان کے چند عشقِ مجازی کے اشعار پہ نظر ڈالتے ہیں:

امید کوئی نہ کوئی وعدہ
ہم تجھ سے کریں نباہ کب تک

میں کہیں بھی امان پا نہ سکوں
تو اگر مجھ پہ مہربان نہ رہے

ذکر میرا جو درمیاں نہ رہے
رونقِ بزمِ دوستاں نہ رہے

یوں ترا درد پا کے ہم خوش ہیں
جیسے کوئی بڑا خزانہ ملا

آپ کے کلام میں اپنے استادِ محترم کا اندازِ تکلم صاف چھلکتا ہے۔ حسرت فرماتے ہیں کہ:

مرے ڈھب کی کسی نے بھی نہ کہی
یوں تو کتنے پیام بر آئے

اور شفقت کاظمی اپنے استادِ محترم کے متعلق کہتے ہیں کہ:

لا سکا شفقت نہ کوئی رنگ حسرتؔ کی مثال
یوں تو کتنے شاعرانِ خوش کلام آتے رہے

بقول آپکے استادِ محترم کے۔۔۔

شعر دراصل وہی ہوتے ہیں
جو سنتے ہی دل میں اتر جائیں

آپ کی کتب کی تفصیل واشاعت اس طرح ہوئی۔
ا۔''حسرت کدہ'' 1957ء کو مولانا محمد افضل نے علمی کتب خانہ مظفر گڑھ سے شائع کی۔ اس کتاب میں ایک سو پانچ غزلیں اور گل صد برگ کے نام سے سترہ اشعار شامل ہیں۔
2۔''نغمہء حسرت'' 1959ء کو مولانا افضل صاحب نے مظفر گڑھ سے شائع کی۔اس میں ایک سو بتیس غزلیں اور لخت لخت کے عنوان سے ستر اشعار شامل ہیں۔
3۔''داغِ حسرت'' 1970ء کو اپنے خرچ سے لاہور سے شائع کروائی۔اس میں ایک سو تین غزلیں اور باون متفرق اشعار شامل ہیں۔اس میں دو غزلیں ایسی ہیں جو 1960ء سے 1967ء تک لکھی جاتی رہی ہیں۔اس کا مقدمہ غلام رسول مہر نے اور پیش لفظ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے لکھا۔
4۔''زخمِ حسرت'' آخری مجموعہ کلام 1988ء میں آپ کے فرزند سید نجیب الحسن رضوی نے بیکن بکس گلگشت ملتان سے شائع کروائی۔اس کی ترتیب کا کام آپ نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا مگر یوم قضاء نے اجازت نہ دی کہ آپ اس کی اشاعت اپنے دست سے کرواتے ہیں۔اس کتاب میں ایک سو سترہ غزلیں اور ستاون اشعار شامل ہیں۔
آپ کا کلام بھارت کے ایم۔اے اردو اور گریجویٹ کے نصاب میں آج بھی شامل ہے اور پڑھایا جا رہا ہے مگر صد افسوس کہ آپ کو اپنے ملک و علاقہ کے بھی مخصوص طبقہ کے سوا کوئی خاص نہیں جانتا۔یہ المیہ ہمارے ہاں بتدریج ہے کہ ہم فانی دنیا کے لافانی لوگوں کی قدر بہت کم کر پاتے ہیں مگر ان کا نام و کام ادب کی دنیا میں مثلِ شمس و قمر تا ابد زندہ و تابندہ رہنے والا ہے۔
آپ کی اپنی اولاد حیات نہ ہونے کے باعث آپ کے بارے میں معلومات کا ذخیرہ

نہایت ناپید ہے۔آپ کے آبائی گھر میں آپ نے نایاب کتب کی ایک ضخیم لائبریری کا انعقاد کیا۔جس کا نام ''شفقت اکادمی'' ڈیرہ غازی خان تھا جو آپ کے بیٹے کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد قرابت داروں نے ردی میں بیچ کر ضائع کردی۔

جن اقرباء سے مجھے آپ کی معلومات ملی ہیں ان کی میں تہ دل سے سپاس گزار ہوں۔انہوں نے مجھے اس عظیم کام میں رہنمائی کر کے میرے ہاتھ اندھیرے میں دیپ تھمایا ہے۔

آپ شدید شوگر کے مرض میں مبتلا ہونے کے باعث 12 مارچ 1975ء کو جامِ اجل نوش فرما کر اس دنیا سے پردہ پوش ہوگئے۔(انا للہ وانا الیہ راجعون)

دنیائے زر نے بات نہ پوچھی تو کیا ہوا
راس آگئی ہمیں بھی خود اپنی قلندری

وہ ایک بات جو ہم زبان پر نہ لا سکے
شاید ہمارے بعد زمانہ سنا سکے

آج بھی آپ کے مزارِ اقدس پر کوئی زائر جائے تو آپ کے کتبے پہ لکھے آپ کے لفظ اس کی آنکھیں نم کردیتے ہیں۔

کتبے پہ لکھا ہوا شعر ملاحظہ ہو:

آپ آئیں تو سہی گورِ غریباں کی طرف
بے کسی بڑھ کے بتادے گی ٹھکانہ میرا

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی صاحب حیثیت اور ادب سے عقیدت رکھنے والا بندہ آپ کے مجموعہ کلام، خطوط اور قلمی نسخوں کو یکجا کر کے کلیات کی شکل میں شائع کروائے تاکہ اس قادر الکلام ہستی کا عظیم کام محفوظ ہو سکے اور آنے والے تشنہ قلبوں کی راہنمائی کا بہتر ذریعہ بن سکے۔

☆☆☆

باکمال فن کی لازوال خدمات

یارب تیری نگاہ کا اُمیدوار ہوں
تو ہی ناصر و نصیر و ربِ غفور ہے
سراسر تیری ذات ہے رحمان و رحیم
میرا ہر اِک جزو سراپا قصور ہے
(سید مشتاق احمد شاہ صاحب)

جس ہستی کو قلمبند کرنے چلی ہوں وہ میرے رشتے میں بزرگِ محترم لازوال فن وجرائتوں کے مالک پدرِ نانا حضور ہیں۔آپ کا مکمل نام سید مشتاق احمد جعفری ہے۔آپ کی تاریخ پیدائش 19/04/1919 ہے۔آپ پیشہ کے لحاظ سے ایک پینٹر تھے۔آپ کا شجرۂ نسب حضور پاک (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی آلِ اطہار سے حضرت علی المرتضیٰؑ کے بیٹے امام جعفرِ صادقؑ کے فرزند العراضی سے منسوب ہے۔اسی طرح آپ کے ننھیال بھی آلِ رسول (علیہم السلام) میں سے امام موسیٰ کاظمؑ کے نسب سے منسوب ہیں۔آپ کے نانا جان سید احمد شاہ کاظمی معروف کلاسیکل شاعر ''سید فضل الحسن'' المعروف ''شفقت کاظمی'' صاحب کے برادرِ نسبتی ہیں۔اس طرح آپ نجیب الطرفین سید تھے اور آپ کے ددھیال میں حضرت شاہ عیسیٰ بلوٹ جن کا مزار بلوٹ شریف ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں ہے اور حضرت شاہ شمس تبریز جس کا مزار مدینۃ الاولیا ملتان میں ہے۔آپ کا سلسلۂ نسب انہی جید الاولیاء اللہ سے جُڑا ہوا ہے آپ کے دادا سید احمد شاہ صاحب ملک ایران سے ہجرت کر کے پاکستان کے پرانے شہر ''ڈیرہ غازی خان'' پہنچے اور یہاں سکونت اختیار فرمائی تو یہاں کی زبان ''سرائیکی'' سے شناسائی حاصل کرنا پڑی۔اس طرح آپ کی مادری اور پدری زبان سرائیکی بنی لیکن آپ کو اس کے علاوہ دیگر زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا ان میں عربی، فارسی، انگلش اور اُردو تھی آپ ان تمام زبانوں کو اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے آپ کی پُر اثر شخصیت میں آپ کا دھیما لہجہ ''صاف گوئی'' انصاف پرستی، اصول پسندی،

گندمی رنگت اور قد 5/5 تھی سروس کے دوران جناح کیپ اور شیروانی، سرمئی کوٹ، بھورا اور کالے رنگ کا زیب تن کرتے تھے جبکہ معمول میں سادہ شلوار قمیض کے ساتھ جناح کیپ پہنتے تھے۔ہلکی پھلکی اور صاف ستھری غذا پسند کرتے تھے۔ رزقِ حلال کو اپنا شعار رکھنا اور حرام سے نفرت کرنا ہمیشہ ان کا خاص وطیرہ تھا۔ آپ کا گھریلو ماحول انتہائی سادہ اور پُروقار تھا۔ سادات گھرانہ ہونے کے ناطے انتہائی باپردہ، پاک و پاکیزہ اور تعلیم یافتہ تھا آپ کے والد محترم ''سید اللہ وسایا شاہ'' صاحب تعلیم یافتہ بزرگ تھے اور آپ کے دادا ''سید احمد شاہ'' صاحب بھی حکومتِ برطانیہ کے دَور میں اپنا ایک بلند مرتبہ رکھتے تھے جبکہ اس سے پہلے آپ کے گھرانے کو ایک نمایاں مقام حاصل تھا گزشتہ کئی نسلوں سے وہ ذریعہ معاش کے ساتھ کیلی گرافی، فن پارہ اور برصغیر کے معروف فن نقاشی و خطاطی سیکھنے اور سکھانے میں مصروف تھے یہ آپ کا آبائی خاصہ تھا جس کو آپ نے بھی اپنے شوق میں پوری زندگی قائم رکھا آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز پندرہ برس کی عمر سے ہی شروع کر لیا تھا۔ دُنیاوی تعلیم مکمل کی تو آبائی شوق نے آپ کی سوچوں میں ارتعاش پیدا کر دیا جس کے باعث آپ نے دستکاری کالج کا رُک کیا اور اپنے آبائی ہُنر اور شوق کو نیا انداز دینے کی ٹھان لی، ووکیشنل کی سند حاصل کرنے کے بعد دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے فن فوٹو گرافی جو کہ اُس زمانے میں ایک نئی ایجاد تھی۔ حاصل کرنے کی غرض سے دہلی کا رُخ کیا جہاں سے یہ فن تھوڑے ہی عرصے میں مکمل حاصل کرنے کے بعد لاہور پہنچ کر اپنے فن کو عام کرنے کی غرض سے کیمرہ اور لیبارٹری کے لوازمات خرید کرتے ہوئے اپنے آبائی شہر ڈی جی خان آ کر یہاں کے لوگوں کو اس جدید سہولت سے آراستہ کرنے کے لیے ایک فوٹو گرافر لیبارٹری قائم کر لی مگر اس جدت کو اپنانے کے ساتھ آپ نے اپنے آبائی فن کو بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ آگے بڑھایا جب تقسیم ہند پایہ تکمیل کو پہنچی تو اپنی تعلیمی اور فنی قابلیت کی بنا پر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کے محکمے میں بطور پینٹر سرکاری خدمات پر معمور ہو گئے بے حد مصروفیت اور وقت کی قلت کے باعث اپنے بھائی سید منظور احمد شاہ کو اپنے ساتھ فوٹو گرافری میں باقاعدگی کے ساتھ تربیت دینی شروع کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج شہر ڈیرہ غازی خان کے سب سے پہلے فوٹو گرافر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں آج بھی ان کے

درجنوں شاگرد اس فن کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور صدر انجمن فوٹو گرافرز سید منظور شاہ کے نام سے آج بھی ڈی جی خان کا ہر شہری واقف ہے اور اس میدان میں اُنہوں نے بہت سے ایوارڈز بھی اپنے نام کیے۔ جب فوٹو گرافی میں چھوٹے بھائی نے اپنا مقام پالیا تو آپ نے اپنے آبائی فن کی طرف پوری توجہ دی اور اپنے کئی نامور شاگرد پیدا کیے جن میں معروف ''بشیر کاتب صاحب'' کا نام سرفہرست ہے۔ جن کے شاگرد ''شمیم الخطاط'' صاحب کو آج ایک نمایاں مقام حاصل ہے اپنے فن کو زندگی دینے کے لیے فنکار اپنی محنت اور سوچ کو دوسروں تک پہنچا کر ہی خوشی محسوس کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کے شاگرد کسی مخصوص طبقہ کے لوگ نہ تھے بلکہ جس کو بھی فن کی تلاش ہوئی تو اس نے آپ کے دروازہ پر آ کر اپنی تشنگی کو سیراب کیا دُنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم پر بھی آپ نے بھرپور توجہ دی قرآن کریم کی تعلیم ترجمہ و تفسیر کے ساتھ حاصل کی۔ دُنیاوی تعلیم سیکنڈری درجہ تک حاصل کی دینی علوم میں قرآن کریم مع ترجمہ و تفسیر کے علاوہ علم الاعداد، علم ابجد، علم نجوم، علم ہندسہ، علم جفر کے ماہر ہونے کے ساتھ ان کے مانے ہوئے عاملِ عملیات تھے۔ انہوں نے بارہا مرتبہ روحانی چلے بھی پورے کیے ان کا مشہور چلہ پیر سید ملا قائد شاہ کے مزار پر تھا اپنے عملیات کے فیض سے بہت سے لوگوں کے گھریلو، دینی و دُنیاوی، کاروباری اور روحانی مسائل حل کیے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے دیئے ہوئے فیض کی بدولت جب نافرمان اولاد بھی اپنے والدین کی تابع فرمان ہونے لگی تو ملک سعودی عرب سے شاہی گھرانے کے ''شیخ صالح محمد'' آپ کے دولت کدہ پر خود چل کر آئے اور آپ کی عملی طاقت و بصیرت کا اعتراف کیا اور مسلسل اصرار کے بعد آپ کو اپنے ساتھ سعودی عرب لے گئے آپ نے وہاں بھی شاہی خاندان کے کئی بگڑے ہوئے بے راہ روی کا شکار جوانوں کی اصلاح فرمائی اور سات ماہ تک ارضِ مقدس پر مہمان رہے حج و عمرہ کی سعادت حاصل کی اور وطن واپس لوٹ آئے آپ ہر دینی مسئلہ پر تمام مکاتب فکر کے علما اور آئمہ کے بارے میں مکمل علم رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والا آدمی آپ سے کسی بھی مسئلے پر معلومات حاصل کرتا تو آپ اس کو جس امام کا وہ پیروکار ہوتا اسی کے فتویٰ و بیان کے مطابق مطمئن کرتے کسی بھی ضروری مسئلے کی وضاحت میں ہر وہ دلیل پیش کرتے جو قرآن و سنت کی روشنی میں

ہوتی۔آپ کی ذاتی لائبریری میں تفسیر قرآن پاک، مولانا مودودی، علامہ حسین بخش، جاڑا کی تفاسیر، آئمہ طاہرینؑ کی سوانح حیات ''چودہ ستارے'' تواریخ کی کتب میں تاریخ طوسیؒ اور تاریخ طبریٰ وغیرہ شامل تھیں آپ کا حلقہ احباب لامحدود تھا مگر چند معروف شخصیات جن میں ڈاکٹر غلام فرید خان، ڈاکٹر نذیر شہید، پروفیسر سید محمد عطا شاہ نقوی، شمس العباس شمسی اور زوار حاجی غلام عباس زرگر وغیرہ بھی شامل تھے۔

آپ ''مسجد خواجگان'' بلاک نمبر 8 کو اپنے فن سے مزین کرتے ہوئے گنبد کی بلندی سے گر پڑے جس کے باعث آپ کے دائیں پاؤں کی ایڑی زخمی ہوگئی اور آپ ہرنیا کی تکلیف میں مبتلا ہوگئے اور اپنے محدود وسائل کے باعث مکمل علاج نہ کروا سکے۔ یہی تکلیف طویل عرصہ تک قائم رہی اور صحت مسلسل خراب ہوتی چلی گئی بالآخر اسی مرض کے اثرات کے باعث 24 جون بروز ہفتہ کو معمولی بخار میں مبتلا ہوئے اور 2 جون، 24 رمضان المبارک 1984ء بمطابق 1406 ہجری بروز اتوار کو بوقت نمازِ صبح اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

یوں علوم وفنون کا ایک مکمل باب منوں مٹی تلے جا بسا۔آپ کے فنون میں ہومیو پیتھک کورس، فن فوٹو گرافی، مہر سازی، فنِ شیشہ وکلی سازی، فن مصوری اور پینٹنگ (تصویر کشی) شامل ہیں۔

کچھ نمونے اہل ذوق کی نذر

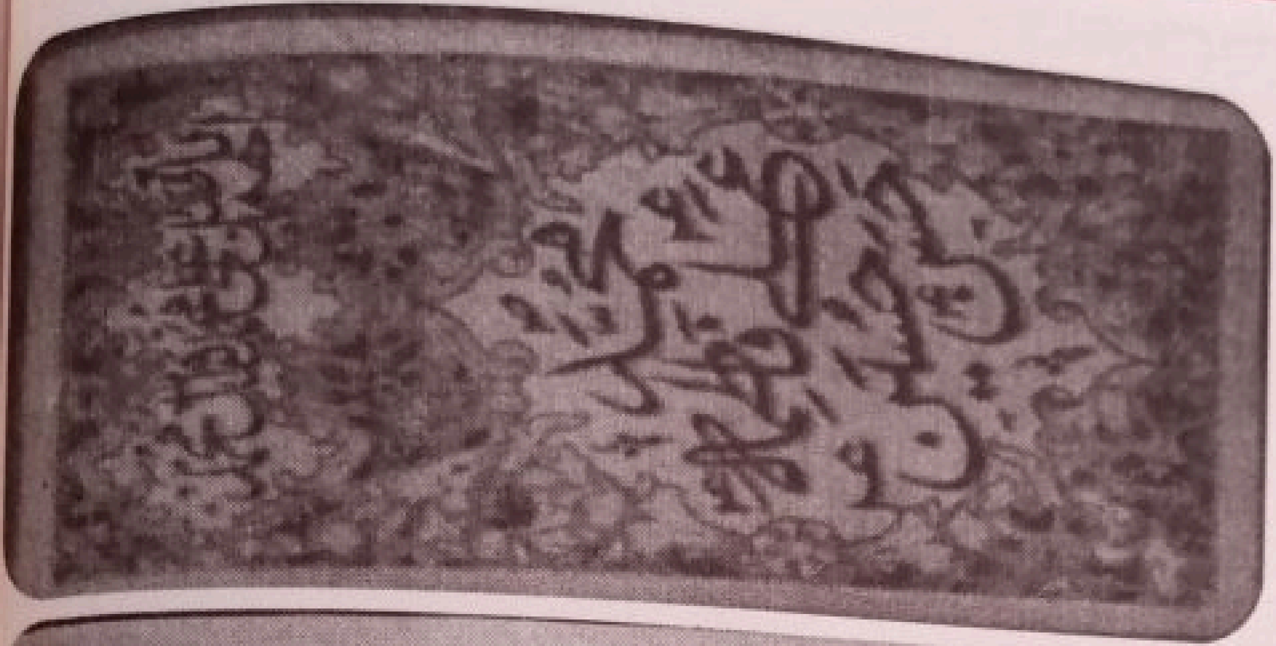
☆☆☆


WEST PUNJAB TRANSPORT SERVICE















علامہ محمد اقبالؒ کا نظریہ تعلیم اور مغربی تہذیب پر ان کے افکار

اقبالؒ ایک ایسے جینئس شاعر ہیں جن کے ہاں ایک مربوط نظامِ فکر موجود ہے۔ان کی شعری اور نثری تخلیقات کو ساتھ ساتھ رکھ کر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ان کے ہاں ایک نوع کا فکری ارتقا ملتا ہے قرآن مجید کی تعلیمات میں گہرا انہماک کثرت مطالعہ، متعدد علمی اسفار نیز اہلِ علم سے مسلسل ذہنی روابط نے اقبالؒ کے افکار میں آفاقی روح پیدا کر دی تھی۔اقبالؒ کے نظامِ فکر کو ہم نظام شمسی سے تشبیہ دیں تو اس میں خودی کو سورج کا درجہ حاصل ہوگا۔اس کی روشنی اقبال کے دیگر افکار کو توانائی بخشتی ہے۔اس نظامِ فکر میں تعلیم ایک اہم سیارے کی حیثیت سے جلوہ گر ہے اس پر اقبالؒ کے فلسفہ خودی کا نمایاں اثر پایا جاتا ہے۔اقبالؒ کا نظریہء تعلیم اپنی فکری غذا قرآن مجید سے بھی حاصل کرتا ہے۔

اُمتِ محمدیہ کا سب سے بڑا وصفِ تعلیم یہی ہے گزشتہ چودہ سو برسوں میں انسان نے جو علمی ترقی کی ہے اس کی روشنی میں ختم الرسل حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پر پہلی وحی کے موضوع کی اہمیت اُجاگر ہوتی ہے یہ وحی ''اقرا'' سے شروع ہوتی ہے اور خالقِ کائنات کی قدرت کے اعتراف پر ختم ہوتی ہے۔اِس آیت میں تعلیم کی غرض وغایت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے ہمارے لیے وہی علم لائق اعتنا ہے جو ہمیں اپنے خالق کا شعور عطا کرے اور ہم اپنی عملی زندگی میں اِس کے فرماں بردار بندے کی حیثیت سے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکیں تاہم تعلیم اقبالؒ کی دلچسپی کے اہم ترین موضوعات میں سے ایک ہے اقبالؒ نے کئی تعلیمی اداروں سے کسب فیض حاصل کیا۔جن کے ہاں مشرق اور مغرب کا خوب صورت امتزاج پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مغرب سے مرعوب نہیں ہیں بلکہ بعض حوالوں سے وہ مغرب کو اس کی دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ مشرق سے فیض حاصل کرے۔ 1899ء میں فلسفہ کے مضمون میں ایم اے کی ڈگری لینے سے تعلیم کا پہلا دَور شروع ہوتا ہے گورنمنٹ کالج لاہور میں جون 1903ء سے 1905ء تک فلسفہ اور انگریزی ادبیات کے اُستاد کی حیثیت سے اپنی تعلیمی قابلیت کو منواتے ہوئے نظر

آتے ہیں۔ اسی اثناء میں اِن کی پہلی کتاب ''علم الاقتصاد'' منصۂ شہود پر آتی ہے۔ رسالہ ''مخزن'' کے شمارہ جنوری 1902ء کے شمارے میں شائع شدہ مضمون ''بچوں کی تعلیم و تربیت'' تعلیمی حلقوں میں خصوصی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ اِس مضمون میں وہ خالص نفسیاتی اصولوں پر مبنی تعلیمی نظام اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں جس سے بچوں میں علم سے دلچسپی پیدا ہو سکے۔ اقبالؒ نے اسی جذبہ کے زیرِ اثر ''ہمدردی'' لکھی جو اِن کے مجموعہ کلام ''بانگِ درا'' میں موجود ہے اقبالؒ کے تعلیمی تصورات کے ارتقاء کا دوسرا دور 1905ء سے شروع ہوتا ہے اور 1914ء تک جاری رہتا ہے اِس اثناء میں وہ دو تین برس یورپ کی علمی درسگاہوں سے متنوع علوم میں دستگاہ حاصل کرتے ہیں اقبال کا یہ دور ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے اور 1922ء تک جاری رہتا ہے۔ اِس عرصہ میں اقبال کے ذہن پر خودی اور بے خودی کے تصورات چھائے ہوئے ہیں۔ یُوں اِس دور میں اقبالؒ کا زور تعلیم کی نسبت تربیت پر زیادہ رہا ہے۔ اقبالؒ کا چوتھا اور آخری دَور 1922ء سے شروع ہو کر 1938ء یعنی اِن کی وفات تک جاری رہتا ہے۔ اِس عرصہ میں اِن کی زیادہ تر توجہ اجتہاد اور افکارِ دینی کی تعمیرِ نو پر ہے اقبالؒ مسلمانوں کے ثقافتی سرمائے کی تعمیرِ نو کے بھی خواہاں ہیں اِسی وجہ سے 1926ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حامن آرنلڈ کے مرتب کردہ بی اے اور ایم اے کے نصاب کو ناقص قرار دیتے ہیں۔ نوجوانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اقبالؒ تعلیمِ نسواں پر بھی خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک تعلیم ایک عمرانی مسئلہ ہے چونکہ عورت ایک خاندان کی بنیاد ہوتی ہے لہٰذا حقیقت میں یہ تمدن کی جڑ ہے اقبالؒ نے عورت کے دو روپ خاص طور پر بیان کیے ہیں بیوی اور ماں۔

عورت کی بدولت خاندان وجود میں آتا ہے خاندان سے گاؤں اور شہر وجود میں آتے ہیں اور یُوں ایک تمدن کی بنیاد پڑتی ہے۔ یہ تعلیم فردِ واحد کی نہیں بلکہ پورے خاندان کی تعلیم بن جاتی ہے۔

وجودِ زن سے ہے کائنات میں رنگ
اِسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
مکالمات افلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطون

عورتوں کی تعلیم کے لحاظ سے اقبال کچھ حدود بھی مقرر کرتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک

عورت کا اصل مقام اُس کا گھر اور شوہر اور بچے ہیں وہ ہر ایسے کام کے مخالف ہیں جس سے عورت کے فرائض زوجیت اور امومت متاثر ہوں۔ اقبالؒ اس کے حامی ہیں کہ عورتیں زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں لیکن اگر وہ اپنے اصل فرائض سے غافل ہو جائیں تو یہ اُن کے اور معاشرے کے حق میں اچھا نہ ہوگا ایسی عورتوں کو وہ ''نازن'' کہتے ہیں۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن

کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

اقبالؒ مخلوط نظامِ تعلیم کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے وہ نہ صرف خواتین کے لیے الگ یونیورسٹی کے داعی تھے بلکہ وہ لڑکیوں کے لیے علیٰحدہ نصاب کی ضرورت بھی محسوس کرتے تھے وہ عورتوں کے نام نہاد حقوق اور مادر پدر آزادی کے خلاف تھے۔ اقبالؒ نے اسلامی تعلیمات کی روح کو پانے کی کوشش کی ہے اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

''لندن کی مشہور دکان (sel Rige) میں خریداری کرتے ہوئے اقبالؒ کی ملاقات ایک سیل گرل سے ہوئی گفتگو کے بعد انہوں نے اپنے ہمراہ امجد علی سے مخاطب ہو کر کہا ''اس خاتون کو کسی کے گھر کی روشنی بننا تھا اولاد کی صحیح تربیت کا فریضہ سرانجام دینا تھا اس کی تخلیق کا مقصد بازار کی رونق بن کر بُرا بین فروخت کرنا تو نہ تھا۔''

''ضربِ کلیم'' میں اقبال نے اپنی نظم ''عورت اور تعلیم'' میں اِس تعلیم کی نشاندہی کی ہے جو عورت کو حاصل کرنی چاہیے۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگِ امومات

ہے حضرت انساں کے لیے اس کا ثمر موت

بے گانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن

ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

اقبالؒ کے نزدیک علم سے مراد کیا ہے۔۔۔؟ اس کا اظہار اِس خط میں بخوبی ملتا ہے جو خواجہ غلام السیدین کے نام لکھا گیا فرماتے ہیں:

''علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے عام طور میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اِس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا

چاہئے اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطانیت ہے یہ علم علمِ حق کی ابتدا ہے۔"

اقبالؒ سیکولر اِزم کو دین و دُنیا کی تفریق کا شاخسانہ سمجھتے ہیں۔ اقبالؒ کے پسندیدہ نظامِ تعلیم میں عشق و عقل کا امتزاج خصوصی اہمیت کا حامل ہے عشق و عقل کے موازنے کے حوالے سے بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ علم کے مقابلے میں عشق کی برتری کو ثابت کرنا چاہتے ہیں علم سے مراد اقبال کے نزدیک وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہو اور عشق سے مراد وہ علم ہے جو شعور میں نہ سما سکے اور اس کا ادراک وجدان کے ذریعے ہو "پیامِ مشرق" کی "نظم "محاورۂ علم و عشق" سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ علم کے دیو کو پابہ زنجیر کرنے کے لیے عشق کو ضروری خیال کرتے ہیں تا کہ علم کی نار نور میں بدل جائے۔ اقبالؒ کے نزدیک علم بے عشق کے کبھی پھل پھول نہیں لا سکتا وہ طاغوتی بن جاتا ہے لیکن علم اگر عشق کی بانہوں میں بانہیں ڈال کے چل سکے تو یہ لاہوتی ہو جاتا ہے۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں

اقبالؒ علم کے ساتھ عشق کو اِس لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ انسان ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد خدا کا نائب بن جائے اور اِس میں اخلاقیات پیدا ہو جائے۔ "جاوید نامہ" میں مومن کی اسی اخلاقیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہر کہ او را قوت تخلیق نیست
پیش ما جز کافر و زندیق نیست

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؒ نے مغربی نظامِ تعلیم کے چند پہلوؤں پر تنقید کی ہے لیکن وہ علمِ جدید کے خلاف نہیں ہیں۔ اس کے برعکس وہ چاہتے ہیں کہ اس علم کے حصول کا طریقہ سیکولر نہ ہو یہ علوم۔

☆☆☆

اُردو تنقید کا مختصر پسِ منظر و اجمالی جائزہ

کسی بھی فن پارے کو اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر علمی و فنی نقطۂ نظر سے اُس کا موازنہ کرنا جانچنا تنقید کہلاتا ہے۔تنقید کو انگریزی میں guticism عربی قواعد کی رُو سے صحیح لفظ تقد یا انتقاد ہے فارسی میں تنقید کی اصطلاح رائج نہیں رہی۔اس میں لفظ انتقاد دیکھنے میں آیا ہے لیکن بہت کم جبکہ اُردو میں لفظ تنقید رائج ہوا ہے تاہم نیاز فتح پوری اور عابد علی عابد دو ایسے ناقدین ہیں جنہوں نے تنقید کے برعکس انتقاد استعمال کیا۔تنقید لفظ کا متبادل کے طور پر آلِ احمد سرور نے پرکھ کا لفظ تجویز کیا ہے۔یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ تنقید ادب اور ادبی تخلیقات کی تفہیم و تشریح کے لیے وقف ہے مگر خود تنقید کی تفہیم و تشریح پر محققین اور ماہرین کا اتفاق رائے نہیں ملتا۔پیشتر تخلیق کاروں کے ذہن میں نقاد اُس جابر سکول ماسٹر کے مترادف ہے جو کسی کو شاباش نہیں دیتا ہے۔ایک دو استثنائی مثالوں سے قطع نظر اُردو ناقدین کی اکثریت ادبی آمر کی نہیں ہے بلکہ اکثریت اُن ناقدین کی ہے جو ہمدردانہ طور پر تخلیقات کا مطالعہ کرتے اور نیک نیتی سے ادبی پارہ کے حُسن و قبح کو اُجاگر کرتے ہیں۔

انگریزی اور اُردو کے چند بڑے ناقدین کے اسماء ایسے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ نقادوں کی اکثریت تخلیق کار بھی ہے۔ان میں ڈرائیڈن، میتھو آرنلڈ، کولرج، ورڈز ورتھ، ٹی ایس، ایلیٹ جبکہ فرانسیسی میں ژاں پال سارتر اور اُردو میں میر تقی میرؔ، میر حسن مصحفیؔ، شیفتہؔ (یہ چاروں تذکرہ نگار ہیں) الطاف حسین حالیؔ، محمد حسین آزادؔ، شبلی نعمانیؔ، نیاز فتح پوری، فراق گورکھ پوری، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، سلیم احمد، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، سجاد باقر رضوی یہ محض چند نام ہی نہیں بلکہ اُردو تنقید میں فکر و نظر کے تنوع کے ضامن ہیں۔جبکہ معاصرین میں سے ڈاکٹر وزیر آغا، انیس ناگی، ساقی فاروقی، شمس الرحمٰن فاروقی، علی سردار

جعفری، جیلانی کامران وغیرہ جیسے بڑے بڑے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔اب ہم تنقیدی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے اُردو ادب کی تنقید کی جانب بڑھیں گے چونکہ اُردو لشکری زبان ہے اس لیے اِس کے ادب و ثقافت میں بھی عربی، فارسی، اور مغربی ادب کے بھرپور اثرات موجود ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے اِن زبانوں کے ادب پر نظرِ ثانی چیدہ چیدہ الفاظ میں کرلیں۔

عربی تنقید کے بارے میں بات کرنے سے پہلے یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ عربی مسلمانوں کی دینی زبان ہے ہی لیکن ایک عرصے تک سرکاری زبان بھی رہی ہے۔برصغیر میں عہدِ غزنوی میں سرکاری زبان عربی تھی اس کے علاوہ عربی ادبی زبان بھی رہی ہے کئی ایسے ممالک ہیں جن کی زبان عربی نہیں لیکن وہاں عربی زبان میں ادب تخلیق ہوا۔ایران اور برصغیر اس کی نمایاں مثالیں ہیں، ایران میں فارسی شاعری کا آغاز عربی شاعری کے زیرِ اثر ہوا فارسی نثر بھی ایک عرصے تک عربی کے اثر سے آزاد نہ ہو سکی۔فارسی تنقید کی عمارت عربی کے تنقیدی اُصولوں پر استوار ہوئی۔اُردو شاعری کا ارتقاء فارسی شاعری کے زیرِ سایہ ہوا اور اُردو کی کلاسیکی شاعری تو فارسی سے اس حد تک متاثر ہے کہ اِسے فارسی شاعری کی پرچھائیں قرار دیا گیا ہے۔اُردو تنقید کے پیمانے بھی فارسی کے ذریعے اُردو تنقید تک پہنچے اس لیے اِن تنقیدی افکار کا سرچشمہ عربی ہے۔مؤرخینِ ادب نے عربی ادب کے مندرجہ ذیل ادوار مقرر کیے ہیں۔

(1) دورِ جاہلیت 475ء سے 622ء

(2) دورِ خلفائے راشدین و اُموی 622ء سے 750ء

(3) دورِ عباسی 750ء سے 1258ء

(4) دورِ ترکان 1255ء سے 1798ء

(5) جدید دور 1798ء سے اب تک

تنقید ہمیشہ ادب کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی ہے چنانچہ عربی تنقید بھی ان ادوار کے ساتھ ساتھ چلی ہے۔غزنوی دور میں فارسی تنقید کا آغاز بھی ہوگیا تھا علم بدیع میں فارسی کی پہلی تصنیف غزنوی دَور کے شاعر ابوسعید احمد بن منشوری نے لکھی خورشیدی نے اِس کتاب کی شرح لکھی محمد بن عمر رادھیانی نے ''ترجمان البلاغہ'' کے نام سے فارسی میں بلاغت کی کتاب لکھی ہے اِن سب میں عربی نمونوں کی پیروی کی گئی ہے بلاغت کے یہ موضوعات فارسی کے ذریعے اُردو میں منتقل ہوئے۔

اُردو تنقید پرورش چونکہ فارسی تنقید کے زیرِ سایہ ہوئی اِس لیے اِس موضوع کے حوالے سے بھی مطالعہ ضروری ہے۔فارسی میں تنقید کے لیے نقد کی اصلاح مروج رہی ہے فارسی نقد کا اساسی ہیولا ہمیں تذکروں میں ملتا ہے اور مختلف ادوار کے تخلیق کا ادب پاروں کی تشریح وتوضیح اور تحسین وتردید کے لیے مختلف اصول تشکیل دیتے رہے ہیں جن کو یکجا کرنے سے تنقیدی اصول سامنے آئے ہیں۔یہی تنقیدی اصول بعد میں اُردو شعروادب کی تفہیم وتعمیر کے لیے مستعمل رہے ہیں۔فارسی کی جملہ اصناف شعر،قصیدہ،غزل،مثنوی ،رباعی مرثیہ،مسمط ،تراکیب بند، ترجیع بند، حتیٰ کہ شہرِ آشوب اورواسوخت بھی اُردو میں منتقل ہوئیں۔فارسی میں تنقید کی اصلاح رائج نہیں رہی اس کی جگہ نقد کی اصلاح مستعمل ہے اِن معنوں میں انتقاد کا لفظ بھی دیکھنے میں آتا ہے لیکن بہت کم نقدِ ادبی اور نقد شعر کی اصطلاحیں زیادہ عام ہیں فارسی میں نثر کے بارے میں کہیں کہیں تنقیدی اشارے مل جاتے ہیں مگر فارسی تنقید کا غالب حصّہ شاعری کے اصولِ انتقادیات پر ہی مبنی ہے جس وقت فارسی شاعری کا آغاز ہوا اُس وقت ملک میں عربی کا دور دورہ تھا فارسی شعراء کے سامنے عربی شاعری کے نمونے تھے اور وہ انہی کی پیروی کر رہے تھے تنقید میں بھی وہ عربی اصولوں ہی پر سختی سے عمل کر رہے تھے۔عربوں کی شاعری کا نظامِ اوزان عروض پر مبنی تھا ایرانی بھی اس کی پابندی کر رہے تھے حالانکہ ایرانیوں کا

اپنا نظامِ اوزان بھی تھا مگر وہ آہستہ آہستہ متروک ہوتا چلا گیا اور اِس کی جگہ عروضی اوزان نے لے لی۔ عربی تنقید کے اصول فارسی میں آئے اور فارسی سے اُردو میں منتقل ہوئے اِس طرح سے اُردو تنقید کا رشتہ بالواسطہ عربی تنقید سے قائم ہو جاتا ہے فارسی کے تنقیدی اشارات یکجا نہیں ملتے یہ مختلف عنوانات کے تحت مختلف کُتب میں پائے جاتے ہیں۔

(1) شاعروں کی تنقید

(الف) اقوال (موزوں/غیر موزوں)

(ب) موازنے، محاکے اور ادبی مباحثے

(ت) تنقیدی کتب

(الف) بدیع و بیان و معانی

(ب) عروض و قوامی)

(ج) ادبی کُتب

(ح) نثر نگاروں کی تنقید

(خ) شعراء کے تذکرے

فارسی تنقید کا تعلق بیشتر زبان و بیان اور اسلوب سے رہا ہے اِس میں شاعری کے معنوی پہلو پر بہت کم توجہ دی گئی ہے شاعروں کے کلام کو پرکھتے وقت معائب و محاسنِ سخن کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے اور اِن دونوں کی بنیاد عروض و قوافی بدیع و بیان اور معنی و لگت پر ہے اُردو کی کلاسیکل تنقید نے فارسی تنقیدی اُصولوں کی مکمل پیروی کی ہے اُردو تنقید کے ماخذ بھی فارسی تنقید سے ملتے جلتے ہیں اِن میں شعراء کی تنقید اِن کے مناظرے، محاکے، فصاحت و بلاغت ،ادبی کُتب اور تذکرے شامل ہیں۔

فارسی کی طرح اُردو کے ہر دور میں بڑے شاعر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں یا کھڑے کر دیے گئے ہیں۔ جس طرح فارسی میں شاعری کے دبستان ہیں اِس طرح اُردو

میں بھی ہیں۔ فارسی کے جدید نقاد قدیم تنقید کو نقدِ ذوقی قرار دیتے ہیں۔ اِس کا مفہوم تاثراتی تنقید سے زیادہ قریب ہے فارسی ادب و تنقید کے بعد ہم مختصر سا جائزہ کلاسیکی و جدید مغربی تنقید کے حوالے سے لیتے ہیں کلاسیکی مغربی تنقید کا آغاز یونان اور روم سے ہوتا ہے کیونکہ بیسویں صدی کے اُردو ادب کو مغرب کے تنقیدی نظریات سے شناسائی کے بغیر ٹھیک طرح سے نہیں سمجھا جا سکتا خصوصاً اُردو کی موجودہ تنقید پر مغربی اثرات بہت زیادہ گہرے ہیں گو کہ اُردو ادب پر اُنیسویں صدی کے انگریزی ادب کا اثر زیادہ نمایاں ہے لیکن انگریزی ادب کے اثرات و محرکات کا سلسلہ یونانی اور روسی ادب تک جاتا ہے۔ جس چیز کو آج ہم مغربی تنقید کہتے ہیں اُس نے یونانی اور روسی ادب کی آغوش میں آنکھیں کھولیں۔ یونانی ادب میں تنقید سے قبل شاعری اور ڈرامہ اپنے نکتہ عروج پر پہنچ چکے تھے۔ شاعری میں ہومر اور ہیسی اوڈ جیسے شاعر اور ڈرامہ نگاروں میں الیسکائیلس، سوفوکلیز، یوری پیڈیز اور ارسٹوفیز کے نام مقبولِ عام تھے یونان میں تنقید کے سلسلے میں پہلا نام افلاطون کا آتا ہے اور اِس کے بعد ارسطو کا یونانی تنقید کے یہ دو سرمائے ایسے ہیں اِن کے افکار کی وقعت اتنی زیادہ ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک ادب اور شاعری کی پرکھ کے لیے انہی کے بنائے ہوئے پیمانے مستعمل رہے ہیں۔

ارسطو کے بعد یونانی تہذیب کے زوال اور رومی تہذیب کا عروج شروع ہوتا ہے۔ رومی تنقید میں ہورلیس اور کوئن ٹی لین کے اسماء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح جدید مغربی تنقید کا آغاز سولہویں صدی کے نشاۃ الثانیہ کے دور سے ہوتا ہے سولہویں صدی سے قبل اور ارسطو کے بعد کا زمانہ یورپ میں تاریک دور کہلاتا ہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں یورپ میں ایک زبردست فکری انقلاب آیا اور اُس نے ہر شعبہءِ زندگی کو متاثر کیا۔ آج کا جدید یورپ اِس نشاۃ الثانیہ کے سہارے پر استوار ہے۔ نشاۃ الثانیہ کے ابتدائی تنقید نگاروں میں فلپ سڈنی اور جان ڈرائیڈن کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ دانتے گو کہ اپنے

نظریات کے حوالے سے کلاسیکی فکر کے قریب ہے یورپ کے تاریک دور کے دوران ارسطو کے بعد یورپ میں دانتے کو سب سے زیادہ قبول عام ہوا اپنی ادبی تحریروں اور تنقیدی نظریات کے باوصف دانتے کی حیثیت کلاسیکی اور نو کلاسیکی ادوار کے درمیان ایک کڑی کی مانند ہے دانتے نے لاطینی زبان کو چھوڑ کر دیسی زبان یعنی اطالوی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا یہی نظریہ آگے چل کر یورپ کے افکار کی بنیاد بنا۔اُردو میں تنقید کے متعدد دبستان ہیں جن میں سے ایک نام رومانی دبستانِ تنقید ہے رومانوی تنقید اپنی کچھ خصوصیات کی بنا پر تنقید کے دیگر دبستانوں سے ممتاز اور منفرد ہے۔ انگریزی میں اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ہمارے ناقدین بھی انہی تحریروں سے استفادہ کرتے ہیں رومانیت میں شعراء کا سرچشمہءقوت ابہام سمجھی جاتی ہے۔یہی نہیں بلکہ فعال اور قوی تخیل اپنی انفرادی حیثیت میں بذاتِ خود ابہام کی سطح تک جا پہنچا ہے شدتِ جذبات شاعر کے لیے محرکات کا کام کرتی ہے شاعری کا مقصد حصولِ مسرت ہے۔ورڈز ورتھ فطرت پرست تھا رومانوی شعراء و ناقدین نے حُسن کی عکاسی پر بھی بہت زور دیا کیونکہ حُسن اور اِس سے وابستہ احساسات اور تعینات انسان کی روح پر صحت مند اثرات ڈالتی رہتی ہے۔

A Thing Of Beauty is a joy forever

اِسی طرح کولرج بھی زبان کی اہمیت کا بہت زیادہ قائل تھا۔کولرج نے نقاد کے منصب پر بطور خاص قلم اُٹھایا وہ مختلف زبانوں اور ممالک کی بہترین تخلیقات کے مطالعہ اور تقابل پر بھی زور دیتا ہے اُنیسویں صدی کے وسط کے انگلستان کے لحاظ سے رومانیت کا دبستانِ شعر و نقد کلاسیکیت کے خلاف ردِ عمل اپنے زمانہ کا تقاضا تھا۔

آنے والے زمانے میں اس پر شدید اعتراضات بھی ہوئے عمرانی، مارکسی اور نفسیاتی دبستانوں سے متعلق ناقدین نے اِس پر اعتراضات کیے۔جب اِس تناظر میں رومانیت کا مطالعہ کریں تو نثر میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری کی فکشن یعنی ”خیالستان“ اور کیوپڈ اور

سائیکی کا نام سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد حجاب امتیاز علی تاج کے افسانے اور مرزا ادیب کے ''صحرا نورد کے خطوط اور صحرا نورد کے رومان'' آتے ہیں جبکہ شاعری میں اختر شیرانی کی ''سلمیٰ'' اور ''عذرا'' ہیں۔ انہی کی بدولت وہ شاعرِ رومان کہلواتے ہیں۔

اُردو میں رومانوی تنقید اور ناقدین کے مطالعہ کے سلسلے میں سب سے بڑی اُلجھن یہی ہے کہ جب خود انگریزی میں رومانیت اور اس سے متعلق اصطلاحات کے مفاہیم میں قطعیت ملتی ہے تو پھر اُردو میں اُن کے درست مفاہیم کا کیسے تعین ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک خرابی یہ بھی رہی ہے کہ اُردو ناقدین انگریزی کتابوں سے آراء اقتباسات اور اصطلاحات اخذ کرتے وقت انھیں اصل انگریزی متن اور سیاق وسباق سے الگ کر کے اپنے ذاتی مفہوم میں استعمال کرتے رہتے ہیں جس سے غلط اثر ہوتا ہے اور تفہیم و تحقیق میں اُلجھن بھی پیدا ہوتی ہے اسی لیے تو ایک نقاد نیاز فتح پوری کو تاثراتی نقاد بتاتا ہے تو دوسرا جمالیاتی اور تیسرا رومانی بظاہر یہ تینوں دبستانِ قریب قریب اور بعض کو مترادف نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت تینوں کا جُداگانہ دائرہ کار ہے رومانیت میں چار امور پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

(1) تخیل

(2) جذبہ

(3) زبان

(4) حصولِ مسرت

اگر اُردو کا کوئی نقاد اِن اصولوں کی روشنی میں ادبی تخلیقات کی تحسین و تفہیم کرے تو بلاشبہ وہ نقاد رومانوی کہلوانے کا مستحق ہوگا۔ اُردو شعراء کے تذکرے کئی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں اُردو تنقید کے ابتدائی نقوش اِن تذکروں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے شعراء کے مختصر حالات ان کے کلام کا انتخاب دیا ہے اور اِس پر تبصرہ کیا ہے۔ کہیں شعراء کا موازنہ کیا ہے اور کہیں محاکے کی صورت پیدا کی ہے۔ شعراء کے لطائف اور

چٹکلے درج کیے ہیں ان کی معرکہ آرائیوں کی تفصیل دی ہے۔ اِن سب میں تنقیدی اشارات ملتے ہیں جو اپنی جگہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں اُردو میں باقاعدہ تنقید کا آغاز اُنیسویں صدی کے آواخر میں انجمن پنجاب لاہور میں محمد حسین آزاد کے لیکچر سے ہوا۔ آزاد کے بعد اُردو میں تنقید کو باضابطہ اور فکر انگیز بنانے میں حالی کا مقدمہ شعروشاعری انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور آج تک موضوعِ گفتگو ہے۔ حالی کے بعد شبلی نعمانی، امداد الامام اور مسعود حسین رضوی قابلِ ذکر نقاد ہیں جنھوں نے حالی کے قائم کردہ ادبی تنقید کے شعور کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس دَور کو ہم اُردو تنقید کا دَورِ اوّل کہہ سکتے ہیں جدید اُردو تنقید کا سنجیدہ اور بطور ایک شعبہءِ ادب باقاعدہ آغاز ترقی پسند تحریک کے آغاز سے ہوتا ہے۔ ترقی پسند تنقید کو منوایا اور ہر دوسمت سے بہت سے نام اور نقاد سامنے آئے۔ ترقی پسند نقادوں میں جہاں ابتدائی طور پر سید سجاد ظہیر، آلِ احمد سروؔر اور اختر حُسین رائے پوری وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں وہاں مجنوں گورکھ پوری، پروفیسر احتشام حسین، علی سرور، ادا جعفری، اختر انصاری، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر محمد حسین، ممتاز حسین اور ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ نے ادب کو زندگی کے ساتھ جوڑ کر دیکھنے کی جس روایت کا آغاز کیا اور ادب میں جس موضوعات کا تقاضا کیا وہ آج تک اہمیت کا حامل ہے پاکستان میں ترقی پسند تنقید کے فروغ میں محمد علی صدیقی، ڈاکٹر عتیق احمد، ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر سلیم اختر کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ترقی پسند تنقید کے متوازی حلقہ اربابِ ذوق کا تنقید کا آغاز ہوا، حلقہ اربابِ ذوق سے تعلق رکھنے والے ناقدین میں میراجی، مولانا صلاح الدین احمد، ریاض احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، جیلانی کامران اور مظفر علی سید وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ محمد حسن عسکری قیامِ پاکستان سے قبل ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے لیکن بعد میں اُن کا شمار منحرفین میں ہوا۔ یوں تو اُردو تنقید نگاروں کی فہرست کافی طویل ہے تاہم کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری، سید وقار عظیم، سید عابد علی عابد، سید عبداللہ، مظفر علی سید، سلیم احمد، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم

اختر، ڈاکٹر انور سدید، جیلانی کامران، فتح محمد ملک، تحسین فراقی، شہزاد منظر کے علاوہ ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر بشیر سیفی اور نئی نسل کے بہت سے نقاد اس شعبے میں بڑے خلوص سے لکھ رہے ہیں۔ اُردو میں بالعموم جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کو مترادف سمجھا جاتا ہے۔ جس کا باعث ایک نقاد ایک وقت جمالیاتی اور تاثراتی نقاد قرار پاتا ہے یہ دونوں دبستان جُداگانہ خصوصیات کے حامل ہیں اور اِن سے وابستہ ناقدین مطالعہ ادب تخلیقات کی تحلیل میں الگ الگ طریقے استعمال کرتے ہیں۔ انگریزی میں والٹرپیٹر جمالیاتی تنقید کا اہم علمبردار ہے۔ وہ ادب برائے ادب اور ادب برائے مسرت کا قائل تھا۔ جدید دور میں اطالوی فلاسفر کروچے کے تصورِ اظہاریت نے فلسفۂ جمال اور جمالیاتی تنقید پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ جمالیاتی تنقید کے قدیم ناقدین کے نسخوں میں محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' اور شبلی نعمانی کی ''شعرالعجم'' کا اِس حوالے سے نام لیا جاسکتا ہے۔ اُردو میں جمالیاتی تنقید کی بہت اچھی مثال نیاز فتح پوری کی صورت میں ملتی ہے وہ جمال پرست تھے اور یہی رویہ اُن کی عملی تنقید میں نمایاں تر ہے۔ اس کے بعد عابد علی عابد ہیں گرچہ مجنوں گورکھ پوری نے ایک مختصر کتاب ''تاریخ جمالیات'' لکھی لیکن اُنھوں نے اس نقطۂ نظر سے تنقید نہیں کی ہے اُن کے علاوہ بہت سی کُتب جمالیاتی تنقید کے حوالے سے دیکھنے میں آتی ہیں۔ نیاز فتح پوری کو بیک وقت جمالیاتی اور تاثراتی نقاد کہا جاتا ہے۔ اُردو تنقید کا مطالعہ کرنے پر فراق گورکھ پوری تنقید کی کامیاب ترین مثال قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ آج کل بالعموم کتابوں کی تقریباتِ رونمائی، دیباچوں اور فلیپ کی صورت میں جو تنقید لکھی جارہی ہے اُس کا شمار بھی تاثراتی تنقید ہی میں ہوتا ہے۔ ان میں فکری اور فنی حوالوں سے تجرباتی مطالعہ خال خال ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ترقی پسند تحریک اُردو ادب کی ایک ایسی تحریک ہے جس نے ادب کو زندگی کا ترجمان قرار دیتے ہوئے ادب کے افادی پہلو پر زور دیا برصغیر میں ترقی پسند ادب کی تحریک اپنے زمانہ کے لحاظ سے ایک باغیانہ متنازعہ تحریک تھی۔ انجمنِ ترقی پسند منصفین کی

تاسیس سے ربع صدی قبل ہی پریم چند ترقی پسند افسانے اور ناول قلم بند کر رہے تھے گویا پریم چند ہی ترقی پسند ادب کی تحریک کے پہلے رُکن تھے۔ اِن کے بعد ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، احمد علی، مجنوں گورکھ پوری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، احمد فرازؔ ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، مجروع سلطان پوری، اور ادا جعفری وغیرہ ترقی پسند ادیبوں نے طنز کو کامیاب ہتھیار کے طور پر استعمال کیا کرشن چندر، سعادت حسین منٹو، کہنیا لال کپور، کی تحریریں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جنہوں نے ترقی پسندی کا تصور سے وابستہ فکری اور نظریاتی بحثوں پر قلم اُٹھایا۔

ترقی پسندی جامد تصورِ حیات نہیں اس لیے پاکستان کے مخصوص سیاسی ،سماجی ،اقتصادی اور عمرانی حالات کے مطابق ترقی پسندانہ مقاصد میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ پاکستان کے تنقیدی منظر نامہ پر اِس وقت نفسیاتی، ساختیائی، عمرانی، جمالیاتی کئی دبستانوں سے وابستہ ناقدین سرگرمِ عمل ہیں اور اِن میں ترقی پسند ناقدین بھی ہیں جو اپنی انفرادی حیثیت میں اجتماعیت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اُردو میں نفسیاتی تنقید بھی اپنی خاص اہمیت کی حامل ہے خاصی دیر تک میرا جی کو پہلا نفسیاتی نقاد سمجھا جاتا رہا مگر حقیقت یہ نہیں میرا جی سے بہت پہلے ''امراؤ جان ادا'' کے مصنف مرزا ہادی رسوا کی اِس انداز کی تحریریں ملتی ہیں۔ مرزا رسوا کے بعد جن ناقدین کی تحریروں میں نفسیاتی بصیرت جزوی طور پر ملتی ہے اِن میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجوری (محاسنِ کلامِ غالب) اور وحید الدین سلیم (افادیتِ سلیم) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اِن کے بعد میرا جی کا نام آتا ہے۔ پاکستان میں ایسے ناقدین بھی ملتے ہیں جو کُلی طور پر نفسیات سے شغف نہ رکھنے کے باوجود بعض اوقات مطالعہء ادب میں نفسیات سے کام لینے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اِس ضمن میں محمد حسن عسکری، ریاض احمد، سلیم احمد وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب فرائڈ سے مُتاثر ہیں۔

بھارت میں ڈاکٹر سید محمود حسن رضوی نے ''اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر'' لکھ کر لکھنو یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اُن کے مقالہ کا نام ''نفسیاتی تنقید'' ہے۔اُردو ادب میں ساخیاتی تنقید کا نظریہ نسبتاً نیا ہونے کے باوجود بھی خاصا دلچسپ ہے ساخیات کے بنیادی اُصول سوئزرلینڈ کے ایک ماہر لسانیات فراڈی نیڈڈی ساسر کے مجموعہ مضمون ''course de linguistique general'' سے ماخوذ ہے۔

اُردو میں ساختیاتی تنقید کا نظریہ 1980ء کے بعد ناقدین کی بھرپور توجہ کا مرکز بنا۔ساختیاتی تنقید کے مطابق نقاد فن پارے کی تشریح کرنے کی بجائے اس کے لسانیاتی نظام کی ساخت کا تجزیہ کرنے کے بعد نئے معنی تخلیق کرتا ہے۔مختصر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ساختیاتی تنقید میں تخلیق اور مصنف کے بجائے قاری یا ناقد کو اہمیت حاصل ہوتی ہے یعنی اِس بات سے کوئی سروکار نہیں رکھا جاتا کہ تخلیق کرتے وقت تخلیق کار کے ذہن میں تخلیق کے کیا معنی تھے بلکہ یہ ضروری امر سمجھا جاتا ہے کہ زبان کی ساخت قاری یا ناقد کو کس معانی کی طرف لے جاتی ہے اور ناقد تخلیق سے کیا معنی اخذ کرتا ہے۔یہی ساختیاتی تنقید کے مربوط اصول و ضوابط ہیں جن پر چلنے والا ناقد ساختیاتی تنقید نگار کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ ماہرین ساختیات اِس میں مزید ترمیم کی گنجائش بھی رکھتے ہیں اور نشاندہی کر سکتے ہیں۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ دراہم میں سے کھرے کھوٹے کے فرق کو سمجھنے پر عمل کیا جائے اور تنقید جو کہ باضابطہ علم اور ادب کی روح ہے اِس کو حقیقی معنوں میں سمجھا جائے۔

کُتب برائے حوالہ جات:

(1) اشاراتِ تنقید (ڈاکٹر سید عبداللہ)

(2) تنقید کیا ہے (آلِ احمد سرور)

(3) تنقیدی دبستان (ڈاکٹر سلیم اختر)

(4) آبِ حیات (مولانا محمد حسین آزاد)

☆☆☆

اُردو زبان تاریخ کے آئینے میں

اُردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے اُردو زبان کی ماہیت اِس کے ترکیبی عناصر برصغیر پاک و ہند میں مسلم غیر مسلم اقوام کی آمد اور مقامی زبان وثقافت کے اثرات وغیرہ شامل ہیں۔ جہاں تک اُرسو زبان کی جائے پیدائش تشکیلی مراحل اور پھر مخصوص صورت پذیری کا تعلق ہے تو اِس ضمن میں ماہرین لسانیات نے خاصی خامہ فرسائی کی ہے اُردو لسانیات کا بحیثیت مجموعی مطالعہ کرنے پر یہ امر واضح ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ زور زبان کی پیدائش پر دیا جاتا ہے۔ تاریخ اِس امر کی شاہد ہے کہ قوموں اور نسلوں کے معدوم ہونے کے ساتھ ان کی عمارت کی مانند اُن کی زبانیں بھی آثار قدیمہ میں شمار ہوئیں۔ ہم اُردو، ہندی، تامل، تلنگو، مراٹھی وغیرہ صرف چند معروف زبانوں کے نام سے آشنا ہیں جبکہ برصغیر میں چھوٹی بولیوں اور بڑی بولیوں کی تعداد اگر ہزاروں تک نہیں تو سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اس لسانی تنوع کا سب سے بڑا سبب اس خطہ کی وسعت ہے۔

آج برصغیر تین ممالک میں منقسم ہے۔ جس میں مختلف اوقات میں مختلف زبانیں بولنے والی اقوام اور نسلیں آ کر آباد ہوتی رہیں۔ یہاں آباد ہونے والے گروہ اقوام اور متنوع نسلیں اپنی ثقافت، اساطیر، رسمیں، لباسِ خوراک اور زبانیں بھی ساتھ لائی۔ اگرچہ کچھ عرصہ کی بود باش کے بعد وہ اس خطہ کی ہو کر رہ گئیں لیکن اُن کی زبان، ثقافت اور اساطیر کے قومی عناصر نے اپنا تشخص برقرار رکھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بظاہر یک رنگی کے باوجود اختلافات نے جنم لیا۔ لسانی اور ثقافتی تنوع کے لحاظ سے برصغیر پاک و ہند منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ جب چار ساڑھے چار ہزار برس قبل آریہ وسطی یورپ سے نکلے اور پنجاب میں وارد ہوئے تو انہوں نے پہلے سے آباد دراوڑ، کول وغیرہ نسلوں سے شمالی ہند کا خطہ خالی کرالیا۔ دراوڑوں نے جنوب کا سفر اختیار کیا اور کچھ بلوچستان میں جا بسے۔ ہندوستان میں صوبوں سے تہذیبی،

ثقافتی اور لسانی عوامل کا تال میل جاری تھا کہ مسلمانوں نے اس خطہ کا رخ کیا مگر دیگر اقوام کی مانند مسلمان صرف ایک طرف ہی سے ہندوستان میں وارد نہیں ہوئے بلکہ تین اطراف سے یعنی شمال (پنجاب) مغرب (سندھ) اور جنوب (جنوبی ہند کا مغربی ساحل) پنجاب اور سندھ پر مسلمان حملہ آور ہوئے۔ قابض ہوئے اور حکومت کی جبکہ جنوبی ہند سے عربوں کے تجارتی روابط قبل اسلام ہی سے تھے۔ ہندوستان میں آنے والی اقوام اور مسلمانوں کی آمد میں خاصا فرق ہے۔ دیگر اقوام بت پرست تھیں اور ان کی مخصوص اساطیر تھیں جبکہ مسلمان توحید پرست تھے۔ اِن کا مذہب ہی جداگانہ نہ تھا بلکہ زبان، لباس، رسوم ورواجات اور ثقافت بھی منفرد تھی۔ مسلمانوں میں دو زبانیں بولنے والے شامل تھے۔ عربی اور فارسی، عربی کیونکہ مذہبی زبان بھی تھی اس لیے فارسی کو عربی سے نابلد نہ ہوئے تھے۔ مغلوں کی آمد سے ترکی زبان کا بھی اضافہ ہو گیا۔ ادھر ہندوستان میں متعدد مقامی بولیاں اور زبانیں رائج تھیں۔ ادھر مسلمان مزید زبانیں لے آئے۔ یہ ایسی زبانیں تھیں جو انفرادی حیثیت میں غیر اہم نہ تھیں بلکہ یہ بڑی زبانوں میں شمار ہوتی تھیں۔ یوں ان تمام زبانوں کے تال میل نے زبان کی وہ "حلیم" تیار کر دی جس نے "اُردو" کا نام پایا۔

اسلام تبلیغی مذہب ہے مسلمانوں نے دنیا کے ہر خطہ میں دین اسلام پھیلایا تو وہ تلوار کے برعکس میٹھی زبان سے تھا۔ ہندوستان میں کثیر تعداد میں صوفیا کرام آئے شمال سے لے کر جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک۔ وہ تمام ہندوستان میں پھیل گئے۔ ان کی ارفع شخصیت ذاتی صفات، اعلیٰ کرداری، اوصاف اور پاک اطوار نے ہزاروں افراد کو دائرہ اسلام میں شامل کیا۔ بدلے ہوئے سیاسی حالات کے باوجود آج بھی ہندوستان کے ہر حصے میں صوفیاء کرام کے مزارات مرجع خلائق ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم بھی آتے اور من کی مرادیں پاتے ہیں۔ صوفیاء کرام کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ اُردو زبان کی ابتدائی نشو نما میں ان کے اساسی کردار کو لسانیات کے محققین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحق کی تالیف "اُردو کی ابتدائی نشو نما میں صوفیاء کرام کا کام" (کراچی 1953ء) خاص اہمیت کی حامل ہے۔ میر امن اگرچہ ماہر لسانیات نہ

تھے نہ ہی اُردو زبان سے وابستہ نظریہ سازی کی تاریخ میں اُن کا کوئی اہم مقام ہے مگر "باغ وبہار" کے دیباچہ میں انہوں نے اُردو زبان کے آغاز کے بارے میں جو لکھا اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اقتباس کا آغاز اس معنی خیز فقرے سے ہوتا ہے۔

"حقیقت اُردو کی بزرگوں کے منہ سے یوں سُنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ انھیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاشا بولتے تھے۔ ہزاروں برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود آیا، پھر غوری اور لودھی بادشاہ ہوئے۔ اس آمدورفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی ہے۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا نام چلا جاتا ہے)۔ ہندوستان کو لیا۔ اس کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اُردو کہلایا۔۔۔ اگرچہ دلی جدی ہے وہ پُرانا شہر کہلاتا ہے اور وہاں کے بازار کو اُردوئے معلےٰ کا خطاب دیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ میر امن کے زمانہ میں یہ تصور عام ہوگا کہ مغل لشکر میں مختلف قوموں کے باہمی میل ملاپ کے نتیجہ میں ایسی بولی نے جنم لے لیا۔ جس میں ہر زبان کے الفاظ کی آمیزش اور لہجوں کا امتزاج تھا۔ یوں اُردو زبان "خودرو" پودے سے مشابہ قرار دی جا سکتی ہے کہ کسی شعوری کاوش کے بغیر عوام کے ذریعہ سے اس نے وجود قرار پایا اور اس سے اُردو کے عوامی مزاج کا تعین بھی ہوتا ہے۔ اُردو ایسی زبان ہے جو عوامی ضروریات کے لیے اور عوامی تقاضوں کی تکمیل کے لیے عوام نے وضع کی۔ ترکی زبان میں لشکر کے لیے اردو استعمال ہوتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں زبان کی ساخت کے جس عمل کا آغاز ہوا۔ شاہ جہاں کے عہد تک وہ واضح صورت اختیار کر جاتا ہے۔ گلی محلے کے ساتھ ساتھ اُردو شاہی دربار اور محلات تک بھی جا پہنچی ورنہ شاہ جہاں اسے "اُردو معلیٰ" نہ کہتا۔ بعض ماہرین نے اُردو کے آغاز کی داستان کی کڑیاں صدیاں پیچھے جا کر تلاش کیں۔

جنہوں نے مخصوص علاقہ سے اُردو زبان کا آغاز ثابت کیا اس ضمن میں تین نظریات ملتے ہیں:

(1) "پنجاب میں اُردو" (حافظ محمود شیرانی)

(2) "دکن میں اُردو" (نصیر الدین ہاشمی)

(3) "سندھ میں اُردو" (سید سلیمان ندوی، نقوشِ سلیمانی)

یہ نظریات اُردو لسانیات ، میں خصوصی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد اُردو زبان نے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔اس طویل سفر کے دوران مختلف اقوام اور گروہ اسے مختلف زبانوں کی شکل میں بولتے رہے۔لسانیات کے محققین نے اپنی اپنی تحقیق کی مدد سے اُردو کی ابتدا سے متعلق یہ چند نظریے تشکیل دیئے۔

کسی بھی زبان کے آغاز، صورت پذیری اور پھر تخلیقات سے وابستہ امور کے سلسلہ میں یہ اساسی حقیقت ملحوظ رہے۔کہ زبان خلاء میں تشکیل نہیں ہوتی۔انسانی معاشرہ اِسے پیدا کرتا ہے اور اس معاشرے کے پھلنے پھولنے کے ساتھ یہ پھلتی پھولتی اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کے تناسب سے اس میں بھی تخلیقات ہوتی ہیں۔اردو کے ضمن میں بہر حال ایک بات تو طے ہے کہ اس کی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور آبادکاری اساسی کردار ادا کرتی ہے۔وہ دکن میں آئے یا سندھ میں یا پنجاب میں بہر حال ان کی آمد قدیم ہندوستان میں تہذیبی تغیر کے لیے ایک قومی محرک ثابت ہوتی ہے۔انہوں نے یہاں کی معاشرت، طرزِ تعمیر، تعلیم وتدریس، ملبوسات، خوراک اور آدابِ مجلس میں نئے رنگ شامل کیے وہاں اِن کی عربی فارسی اور ترکی نے مقامی زبانوں کے تال میل سے نئی زبان پیدا کی جو ہندوستان کی مناسبت سے زبان ہندوستان "ہندی اور ہندوی کہلائی" اور پھر مغل دربار نے اسے "اُردوئے معلیٰ" کے خطاب سے سرفراز کیا۔

آج ہم جس اُردو زبان سے فیض یاب ہورہے ہیں وہ صدیوں کا سفر طے کرکے ہم تک پہنچی ہے۔اُردو متعدد زبانوں اور بولیوں سے متنوع رنگ اپناتی ہم تک پہنچی ہے۔یہی اس کی رنگینی کا باعث ہے اور اسی میں ہی اس کی شیرینی پنہاں ہے اور یہ سفر ختم نہیں ہوا بلکہ آج بھی اپنے بازو کھولے غیر ممالک کی اجنبی زبانوں کے الفاظ کا خیر مقدم کر رہی ہے۔

کُتب برائے حوالہ جات:

(1) آبِ حیات (مولانا محمد حُسین آزاد)

(2) تاریخ ادب اُردو (رام بابو سکسینہ)

اُردو نثر کا ارتقائی جائزہ

اُردو زبان کے تشکیلی دور میں ابتدائی شعری نمونوں کے ساتھ ساتھ نثر کے نمونے بھی ملتے ہیں تاہم اُردو نثر کا باقاعدہ آغاز مُلا وجہی کی ''سب رس'' سے سمجھا جاتا ہے۔ اُردو زبان کی تشکیل اور ابتدائی شعری نمونوں کے مطالعہ کے ضمن میں گجری اور دکنی کے تذکروں میں بھی نثر کا حوالہ ملتا ہے چنانچہ جنوبی ہند میں نثر کی اولین کتاب کے سلسلہ میں نصیر الدین ہاشمی کا یہ قول نقل کیا گیا تھا کہ ''حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حُسین المتوفی 825ھ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے دکنی نثر کی ابتدا کی۔ بحوالہ (دکن میں اُردو، ص41)

نصیر الدین ہاشمی نے ان کی یہ کتابیں لکھی ہیں ''معراج العاشقین''، ''ہدایت نامہ''، ''تلاوت الوجود''، ''شکار نامہ''، ''سہ بارہ'' یہ سارے رسالے علم تصوف میں لکھے گئے ہیں۔ افسوس کہ اِن رسائل کے زمانہ تصنیف کا صحیح علم نہیں، لیکن یہ 815ھ، 825ھ کے درمیانی زمانہ کی تصانیف قرار دی جاسکتی ہیں۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

''نبی کہے تحقیق خُدا کے درمیاں تے ستر پردے اور جیالے کے ہور اندھیار کے اگر اس میں تے یک پردہ اُٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔

(معراج العاشقین) بحوالہ (دکن میں اردو ص51)

اس انداز اور اسلوب میں بعض حضرات نے بھی تصوف اور رشد و ہدایت کے رسالے تصنیف کیے۔ اس ضمن میں ''میراں جی''، ''حسن خُدا نما''، ''مولانا عبداللہ''، ''میران یعقوب عابد شاہ'' اور ''سلطان'' کے اسماء گنوائے گئے ہیں۔ ان سب نے تصوف پر رسالے تصنیف کیے اس لیے ان کے اسلوب میں ادبی حسن کی تلاش بے سود ہے۔ ملا وجہی کی ''سب رس'' 1636ء ادبی نثر کا دلکش نمونہ ہے جو اسلوب کی جمالیات کے لحاظ سے آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے ''سب رس'' سے پہلے وجہی نے تصوف پر ایک رسالہ بھی قلم بند کیا۔ بقول وجہی ''یو رسالہ ایک

دریا ہے''۔ ہر ورق ایک موج ہے ہر بات جیوں مانک موتی۔''
''سب رس'' تمثیلی قصہ ہے اس کا موضوع اخلاقی نکات اُجاگر کرنا ہے مگر بات رمزیہ انداز اور شاعرانہ اسلوب میں کی گئی ہے۔ یہ فارسی کے مشہور قصہ ''حسن و دِل'' کا اُردو روپ ہے۔ دکن میں ملاوجہی کی ''سب رس'' کے بعد بھی لفظوں کا سفر جاری رہا لیکن زیادہ تر تصانیف نثر کے مختصر رسالوں کی صورت میں تھیں۔ یہ رسالے تصوف اور اخلاقی موضوعات پر قلمبند کیے گئے۔ شمالی ہند میں اُردو نثر کی پہلی کتاب فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' فضلی کے بقول کمال الدین حسین بن علی الواعظ کی مشہور کتاب ''روضتہ الشہداء'' کا اُردو روپ ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کہتے ہیں ''کربل کتھا'' لسانی اعتبار سے بڑی اہم کتاب ہے ابھی تک ہمارے سامنے شمالی ہند کی نثر کا کوئی بڑا نمونہ نہیں تھا۔ اسی لیے دہلوی زبان کے ہمہ گیر اثرات کا پورا جائزہ نہیں لیا جا سکا اور ہماری ساری توجہ دکنی لیکن میر امن کے خوبصورت اسلوب نے اُسے تخلیقی نثر کی کتاب بنا دیا۔ اُردو اور اس کی لسانی خصوصیات پر مرکوز ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس کی اہمیت میں بھی کلام نہیں اب ''دہ مجلس'' کے چھپنے کے بعد دہلوی زبان کے اثرات کی نشان دہی آسان ہو گی جو دکنی پر ہوئے جو مماثلت یا فرق ہے وہ بھی ایک حد تک ظاہر ہو جائے۔ (کربل کتھا، مقدمہ ص:6)

اُردو نثر کی ترویج و ترقی میں فورٹ ولیم کالج ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انیسویں صدی کا آغاز فورٹ ولیم کالج کلکتہ 1800ء اور میر امن کی باغ و بہار 1803ء سے ہوا۔ اُردو نثر کے لیے یہ اچھا آغاز تھا۔ صدر شعبہ اُردو ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے انگریز اہلکاروں کو اُردو کی تدریس کے لیے سادہ اُردو میں کتابیں لکھوائیں اور ترجمہ کروائیں۔ ''باغ و بہار'' بھی فارسی قصہ ''چہار درویش'' کا ترجمہ ہے۔ میر امن نے ''باغ و بہار کے علاوہ کالج کے لیے 1805ء میں ''گنج خوبی'' بھی تحریر کی۔

''باغ و بہار'' اگرچہ نصابی ضرورت کے لیے ترجمہ کرائی گئی لیکن میر امن کے خوبصورت اسلوب نے اسے تخلیقی نثر کی کتاب بنا دیا۔ اسی لیے دو صدیوں سے ''باغ و بہار'' نے ناقدین سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ گزشتہ دو صدیوں سے ''باغ و بہار'' کے لاتعداد ایڈیشن طبع ہوئے۔ اہلِ نقد نے ہر ممکن طریقہ سے اسے سراہا۔ فورٹ ولیم کالج اور باغ و بہار کی سادہ نگارش کے جواب میں مقفیٰ اور مرصع اسلوب میں 1825ء میں داستان رقم کی۔

''فسانہ عجائب'' سرور چونکہ سلاست کے خلاف ردِ عمل کا اظہار کر رہے تھے اس لیے شعوری طور پر نثر کو زیادہ سے زیادہ رنگین بنانے کی سعی کی۔ یوں کہیے کہ نثر میں ایک طرح کی ''گلزارِ نسیم'' رقم کر ڈالی۔ ''فسانہ عجائب'' کا نثر میں شعری چٹخارہ استعاروں کا تڑکا عین لکھنوی مزاج کے مطابق تھا۔ چنانچہ لکھنؤ میں اس نے خصوصی پذیرائی حاصل کی۔ لکھنؤ ہی میں ان شاء اللہ خان انشاء نے منفرد تجربہ کیا کہ عربی فارسی الفاظ سے معرا ءخالص اُردو میں ''کہانی رانی کیتکی'' کنور اودھے بان کی قلمبندکی اور اُردو کے برعکس اسے ہندوی قرار دیا۔ یوں انشاء نے اٹھارہویں صدی کے لکھنؤ میں امیر خسرو کے عہد کی زبان میں نثر نگاری کے جوہر دکھائے۔ انشاء طبعاً جدت پسند تھے۔ اسی لیے تجربات واختراعات سے ذہنی جستجو کا اظہار کرتے رہے۔ جہاں تک مرزا غالب کی نثر بصورت خطوط کا تعلق ہے تو وہ اُردو نثر کے کسی رجحان، تخلیقی میلان یا سر سید تحریک سے مطابقت نہیں رکھتی۔ غالب نے احباب کو جو خط لکھے وہ ذاتی نوعیت کے اور بغرض اشاعت نہ تھے۔ اب یہ غالب کی تخلیقی شخصیت کا اعجاز ہے کہ نجی خطوط نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ آج وہ تخلیقی نثر کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ غالب کی زندگی میں خطوط کا ایک ہی مجموعہ ''عودِ ہندی'' 27 اکتوبر 1868ء چھپا۔ ''اُردوئے معلیٰ'' دوسرا نسبتاً زیادہ معروف مجموعہ انتقال کے بعد 6 مارچ 1869ء کو چھپا اس کے بعد جیسے جیسے خطوط دریافت ہوتے گئے، طبع ہوتے گئے ہیں۔

غالب کے خطوط محض اچھی نثر سے بڑھ کر سوانحی، تاریخی، نفسیاتی، ادب اور شاعری کے لحاظ سے حوالے کی چیز بن چکے ہیں۔ مرصع نگاری، منظر کشی، مکالمے کا میزان ہے۔ الغرض غالب کے خطوط میں الفاظ چمکتے اور فقرے مہکتے ہیں۔ خطوطِ غالب کی سادہ نثر کے علاوہ سر سید احمد خان اور اُن کے رفقاء کی نثر نے اُردو زبان کے خدوخال سنوارنے میں اور اُسے علمی زبان بنانے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1857ء میں مغل سلطنت کے خاتمہ کے بعد ہندوستان براہ راست سلطنت برطانیہ کے زیر انتظام آ گیا تو مسلمانوں میں احساسِ شکست کی پژمردگی اور ذہنی جمود کی فضا میں سر سید احمد خان نے اپنی جس اصلاحی تحریک کا آغاز کیا وہ اتنی ہمہ گیر تھی کہ اس نے معاشرہ، ادب، تعلیم، مذہب سب پر گہرے اثرات ڈالے سر سید کی نثر کا جائزہ لیں تو یہ دلچسپ بات سامنے آتی ہے کہ جس زمانہ میں غالب دوستوں کو بے تکلفی کے اسلوب میں خطوط لکھ رہے تھے۔ اسی زمانہ میں سر سید روایتی پر تکلف اسلوب کے ساتھ ''آثار الصنادید'' 1847ء میں قلمبند کرتے ہیں لیکن جب انہوں نے اپنی مساعی کا آغاز کیا تو انہیں احساس ہوا کہ اگر عوام کو اپنے مقاصد میں شریک کرنا ہے تو پھر ان کی سطح پر آ کر ان کے لہجے میں بات کرنی چاہیے چنانچہ جب 1854ء میں ''آثار الصنادید'' کا دوسرا ایڈیشن آیا تو وہ رنگین نگاری کے برعکس سادہ اور سلیس نثر تھا۔ سر سید نے لندن کے سفر کے بعد 24 دسمبر 1870 کو مجلّہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء کیا جس میں وہ اور اُن کے رفقاء تاریخ، سیاست، معاشرہ، اخلاق، مذہب اور عصری صورت حال سے متعلق موضوعات پر مضامین لکھتے تھے۔ اس ضمن میں نواب وقار الملک، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی جیسے حضرات کے اسماء ملتے ہیں لیکن اصل شہرت الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی اور ڈپٹی نذیر احمد کو حاصل ہے۔ شاعری بالخصوص غزل کے مقابلہ میں اس عہد میں نثر نے زیادہ فروغ پایا چنانچہ نثر کے عناصر خمسہ یعنی سر سید، حالی، شبلی، آزاد اور نذیر احمد

ہیں۔ان کی وجہ سے اُردو نثر میں سلاست کا چلن عام ہوا۔اس عہد میں نثر کو قوم کی ذہنی کشادگی اور وسعتِ فکر کے لیے استعمال کیا گیا۔یوں بالواسطہ طور پر سرسید کے مقاصد کو تقویت حاصل ہوئی۔اُردو نثر نے ان تمام مراحل سے گزر کر اپنی ایک الگ شناخت بنائی۔آج ہم جس اُردو نثر سے آشنا ہیں یہ اپنے کٹھن ارتقائی مراحل سے گزر کر ہمارے سامنے اپنے جدید اسلوب کے ساتھ موجود ہے۔

حوالہ کتب:

”وجہی سے عبدالحق تک“ ڈاکٹر سید عبداللہ

”سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی اُردو نثر کا فکری وفنی جائزہ“ ڈاکٹر سید عبداللہ

☆☆☆

اُردو غزل کا آغاز

غزل اُردو شاعری کی مقبول صنفِ سخن ہے اسے ہر دور میں قبول عام حاصل رہا ہے۔ حسن و عشق کے بنیادی موضوع کے باوصف اس میں مذہب، فلسفہ، تصوف، اخلاقیات، حیات و لحات دیگر موضوعات کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ غزل کی ابتداء دکن میں ہوئی اور ولی دکنی اُردو کا پہلا شاعر ہے اُنھیں اُردو شاعری کا باوا آدم بھی کہا گیا ہے۔ مگر تاریخی طور پر یہ درست نہیں کیونکہ ولی سے پہلے بھی غزل کی روایت ملتی ہے۔ بہرحال اِس کے باوجود ولی کی اہمیت برقرار ہے کہ انہوں نے دکنی اُردو کی جگہ وہ اُردو رائج کی جو تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ آج بھی مروج ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، نظم وغیرہ اُردو شاعری کی خاص اصناف قرار دی جاتی ہیں۔ ہر ایک صنفِ سخن کا اپنا لب ولہجہ، آہنگ اور انداز ہے لیکن جو مقبولیت صنفِ غزل کو حاصل ہوئی وہ کسی اور صنف کو میسر نہیں اِسے ولی اور سراج کے دور میں بھی قبولِ عام کا درجہ حاصل رہا۔ غالبؔ و داغ کے زمانے میں بھی یہ سرخرو رہی اقبال و حسرت کے عہد میں بھی یہ اپنی عظمت کا ڈنکا بجاتی رہی ہے اور آج کی اٹامک اِنرجی کے دَور میں بھی اس کا حُسن و جمال ماند نہیں پڑا ہے۔ جہاں تک غزل کے معنی کی بات ہے تو اس کے لغوی معنی عورتوں کے متعلق باتیں کرنا ہے بادی النظر میں غزل عورتوں کے حُسن و جمال کے اظہار اور عشق و محبت کی واردات کے تذکرے کا نام ہے لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ یہ صنفِ سخن کسی بھی دور میں اپنے لغوی معنی میں محدود ہو کر نہیں رہی اگر بغور جائزہ لیا جائے تو غزل کے ہر شعر میں ایک دُنیائے معنی پنہاں نظر آئے گی مذہب، فلسفہ، تصوف، اخلاقیات، حیات و ممات، سیاسیات، معاشرت و معیشت غرضیکہ زندگی کے گوناگوں حالات و واقعات دو مصرعوں میں متحرک دکھائی دیں گے۔ غزل کا ہر شعر ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنی

جگہ مکمل ہوتا ہے دو مصرعوں میں جذبات و مشاہدات کا سمندر موجزن ہوتا ہے۔ ایجاز و اختصار کے باوجود ہر شعر وسیع مضمون کا مظہر ہوتا ہے۔ جس خیال اور موضوع کو نظم گو طویل سلسلہ اشعار کے ذریعے پیش کرتا ہے ایک غزل گو شاعر اسی بات کو نہایت فنکارانہ طور پر دو مصروں میں پیش کر دیتا ہے۔ یہی ایجاز و اختصار غزل کی خوبی ہے غزل گوئی آسان نہیں اس میں طبع آزمائی کرنا اور تمام لوازمات کو بروئے کار لانا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں اچھوتے خیالات نت نئے تجربات اور حقیقی جذبات کو دو مصروں میں اس طرح پیش کرنا کہ زبان کی شیرینی برقرار رہے، لہجے کا حُسن بھی قائم رہے اور تاثیر کی فراوانی بھی بدرجہ اتم موجود ہو کوئی سہل کام نہیں۔ شدید مخالفتوں کے باوجود غزل کی مقبولیت کی نمایاں وجہ یہ ہے کہ غزل گو شاعر اپنے خیالات و جذبات کو اس سلیقے، حُسن اور خوبصورتی سے پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والا اِن کو اپنا ہی خیال اور جذبہ سمجھتا ہے گویا شاعر اور قاری و سامع کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہتا دونوں کے ادراک کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ اُردو غزل گوئی کا رواج چونکہ فارسی غزل کی تقلید میں ہوا اِس لیے اِس کی ہیئت اور مضامین میں زیادہ تر وہی رہے ہیں جو فارسی غزل کے ہیں تاہم شعرائے اُردو نے ملکی عناصر بھی اپنی غزلوں میں داخل کیے ہیں چنانچہ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات میں مقامی اثر بھی ملتا ہے۔ اُردو غزل کی ابتدائی نشونما دکن میں ہوئی دکن کی ریاستیں مغلوں کے سیاسی اثرات کی طرح اِن کے تہذیبی اثر سے بھی خود کو آزاد رکھنا چاہتی تھیں اس کوشش کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ سلاطین دکن نے فارسی کی جگہ مقامی یعنی دکنی اُردو کی سرپرستی کی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اُردو کا پہلا "کلیات" مرتب کیا جس میں بہ کثرت غزلیں موجود ہیں۔ دکن کے غزل گو شعراء میں سب سے زیادہ شہرت ولی کو حاصل ہوئی۔ محمد شاہ کے عہد میں ولی دکنی دِلی آنا اُردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے ایک طرف تو ولی نے اپنی دکنی اُردو کو دِلی کی ٹکسالی اُردو میں ڈھالا، دوسرے اِن کے کلام کی مقبولیت کو دیکھ کر دِلی کے فارسی گو شعراء اُردو میں غزل کہنے لگے اِس عہد کے جو

شعراء ولیؔ سے متاثر ہوئے اِن میں آبروؔ، ناجیؔ، مضمونؔ، یکرنگؔ، آرزوؔ اور شاہ حاتمؔ جیسی شخصیات شامل ہیں۔ اشرف علی فغاںؔ اور مرزا مظہر جانجاناں کے نام بھی اس دور میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس دور کے چند شعرا کے اشعار دیکھئے:

زندگی دردِ سر ہوئی حاتمؔ
کب ملے گا مجھے پیا میرا
(شاہ حاتمؔ)

قول آبروؔ کا تھا کہ نہ جاؤں گا اِس گلی
ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا
(شاہ مبارک آبروؔ)

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
(ولیؔ دکنی)

اُردو غزل کے دوسرے دور میں میرؔ، سوداؔ، اور دردؔ جیسے باکمال شعرا پیدا ہوئے۔ اِن سبھی نے اُردو غزل کو ابہام گوئی اور لفظی گورکھ دھندوں سے پاک کیا، زبان صفائی اور اندازِ بیاں کی خوبی اِس عہد کی نمایاں خصوصیت ہے۔ میرؔ کو ''خدائے سخن'' کے لقب سے نوازا گیا، وہیں دردؔ کا کلام تصوف، اخلاق اور درد واثر سے مملو ہے وہ چھوٹی بحر کے بادشاہ سمجھے جاتے ہیں۔ سوداؔ نے فنِ غزل گوئی کو نکھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اُردو زبان کے ایک عظیم معمار بھی ہیں یہ زمانہ سیاسی انتشار اور بدامنی کا تھا دِلی کی تباہی کے نتیجے میں میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، انشاءؔ، مصحفیؔ اور جراتؔ جیسے شعراء وہیں سے نقل مکانی کر کے لکھنؤ آئے یُوں اس علاقے میں ایک نئے اندازِ سُخن کی ابتدا ہوئی جسے لکھنؤ کا ''دلستا شاعری'' کہا جاتا ہے لکھنؤ اسکول کے مشہور شاعر آتشؔ اور ناسخؔ ہیں اِدھر دِلی اسکول اُردو غزل کا مرکز بنتا ہے

غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، مجروحؔ اور شیفتہ جیسے شعراء غزل سرائی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ میر و سودا کی طرح یہ دَور بھی اُردو غزل کی تاریخ کا نہایت تابناک دور غالبؔ خاص طرز کے موجد ہیں۔ غالبؔ نے فطرتِ انسانی کے ہر پہلو کو غزل کے سانچے میں ڈھال دیا۔ حدت طرزِ ادا، تخیل کی بلند پروازی اور معنی آفرینی اِن کی غزلوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ مومنؔ کی عشقیہ شاعری اُردو ادب کا سرمایہ ہے۔ ذوقؔ کے کلام میں روانی اور ترنم ہے۔ ظفرؔ نے غزل میں نئی زمینیں نکالیں اِن کے کلام میں جو دردمندی اور خستگی ہے وہ اُن کی مغموم زندگی کی ترجمان ہے۔

اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں ممتاز غزل گو سامنے آئے اِن میں امیر اللہ تسلیم، امیر مینائیؔ، داغؔ، جلالؔ، رشکؔ اور الطاف حسین حالیؔ ہیں۔ داغؔ اپنے زمانے کے بڑے غزل گو شاعر تھے۔ حالیؔ جدید شاعری کے پیش رو ہیں۔ حالیؔ کے بعد فنِ غزل گوئی کو توانائی علامہ اقبال نے عطا کی۔ اقبالؔ نے اُردو غزل کو جدت سے ہمکنار کیا اور اس کی حدود بدل دیں۔ حسرت موہانیؔ نے اپنی غزلوں میں حُسن و عشق کی دلکش ترجمانی کی ہے۔ اصغر گونڈوی کے کلام میں صفائی بھی ہے اور انہوں نے تصوف کے موضوع کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ جگرؔ کے یہاں انفرادی سرمستی ہے۔ آرزو لکھنوی نے خالص اُردو کے نمونے غزل کے ذریعے پیش کیے۔ فراقؔ نے غزل کے موضوعات اور اندازِ بیاں میں نئی وسعتیں پیدا کیں۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

اس شعر کے خالق صفیؔ لکھنوی تھے جنہوں نے اپنے اثر آفرین کلام سے اُردو شاعری کا رُخ بدلا اور غزل کے لیے نئی عمارت تعمیر کی اس دور میں جو غزل گو شعراء اپنے کلام سے شبستانِ ادب کو درخشاں کیے ہوئے تھے ان میں آرزو لکھنوی امتیازی مقام کے حامل

ہیں۔آرزو کے انفرادی رنگ اور طرزِ سخن نے صرف سخن فہموں کو ہی نہیں چونکایا بلکہ سخن سنجوں کو بھی نئی راہیں دکھائیں۔دُنیائے تغزل میں اِن کے الفاظ نے جو عمارتیں تعمیر کی ہیں وہ بڑی پائیدار اور خوبصورت ہیں ہم اِن الفاظ کی ایک اینٹ بھی کہیں سے نہیں کھسکا سکتے۔یہاں اِس حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ آرزو لکھنوی کی شاعری دو مختلف اور متضاد ادوار کے بیچ کھڑی تھی ایک دور جو زوال پذیر ہو رہا تھا اور دوسرا فروغ پا رہا تھا۔امیر مینائی اور داغ دہلوی کا دور اختتام پذیر ہو چکا تھا اب غزل گوئی نئی ڈگر پر چل کھڑی ہوئی تھی۔ایک ایسے معاشرتی نظام میں جس کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔نئے غزل گو شعراء نے زندگی اور ادب کے مابین ربط قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

اس سلسلے میں اقبال کی غزل اپنے رنگ و آہنگ کے لحاظ سے نہ صرف نئی دُنیا کی نقیب بنی بلکہ غزل کا مزاج بھی تبدیل کرتی نظر آتی ہے۔اِن کے ساتھ ساتھ حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، مجاز لکھنوی، ثاقب لکھنوی، احمد ندیم قاسمی، حفیظ ہوشیارپوری صوفی مصطفیٰ تبسم وغیرہ خاصے نمایاں ہیں۔اِن کے بعد جو غزل گو شعرا سامنے آئے وہ یوں تو قیامِ پاکستان سے پہلے بھی اِس سخن کی آبیاری کر رہے تھے مگر اب نئی مملکت میں نہایت دلجمعی کے ساتھ اِس صنف کو تاب و توانائی عطا کرنے میں پوری طرح منہمک ہو گئے۔اِن میں ناصر کاظمی، ابنِ انشاء، شہرت بخاری، قابلِ ذکر ہیں۔

پاکستانی غزل کے اِس دور میں جو شعرا غزل کی حیثیت سے اُفق شاعری پر نمودار ہوئے اِن میں احمد فراز، شہزاد احمد، ظفر اقبال، منیر نیازی، شکیب جلالی، باقی صدیقی، افتخار عارف، پروین شاکر، زہرہ نگاہ سلیم احمد، سیفی وغیرہ اپنے فکر و فن کی بدولت ایک امتیازی مقام کے مالک ہیں۔غرض غزل گوئی اپنے طویل سفر میں مختلف مراحل سے گزری اِس نے مختلف زمانے دیکھے اَن گنت تجربات کی زد میں آئی جو سچ پوچھئے تو غزل ہماری تاریخ کے ہر مڑتے دھارے کا پتہ دیتی ہے۔زمانے کی اونچ نیچ کا اظہار بھی ہوا ہے اور محرومیِ دِل کا رونا بھی، ہندوستان کی غلامی پر خون کے آنسو بھی اِسی غزل میں بہائے گئے۔سیاسیات، سماجیات اور معاشیات کے مسائل کو بھی غزل ہی کے پردے میں پیش کیا گیا ہے غرض ایسا کوئی موضوع

نہیں جو اُردو غزل میں نہ ملے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صنفِ سُخن میں بڑی وسعت ہے کوئی ایسا موضوع نہیں جو اس کے دامن میں نہ سما سکے۔ یہ نہ صرف انسانی جذبات و محسوسات کی عکاسی کرتی رہتی ہے بلکہ اِس نے سماجی کیفیتوں کا بدلتا ہوا ہر نقشہ بھی کھینچا ہے اور اب اس سائنسی دور میں اُردو غزل نے سیاسیات، معاشیات عمرانیات، فلسفہ، تہذیب واقدار کے مختلف شعبوں کے مسائل کو بھی اجاگر کرنا شروع کر دیا ہے۔ گویا غزل گوئی کی تاریخ بڑی جان دار ہے اُردو کے نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے جسے ''نیم وحشی صنفِ سخن'' قرار دیا تھا وہ اُردو زبان وادب کی آبرو ہے اور شیشہ آبرو کو داغدار کرنا نقادانِ ادب کا کام نہیں۔

چنانچہ غزل اُردو ادب و زبان کا جُھومر ہے جس کی اہمیت ہر گزرتے دَور میں بڑھتی نظر آتی ہے اور اِس نے اپنے دامن کو ہمیشہ وسیع تر رکھا ہے اور ہر دَور کے تقاضوں کو اپنے دامن میں جگہ دی یوں ہم اس کے آغاز سے لے کر آج موجودہ دَور تک اُسی آب و تاب کے ساتھ نِکھرتا سنورتا اور پھلتا پھولتا دیکھتے ہیں۔

☆☆☆

سر سید احمد خان سید تھے۔ اگر سید تھے تو خان کیوں۔۔۔؟

حوالہ نمبر (1) کتاب ''السالیب نشر اُردو کوڈ نمبر 5609
''مضامین سر سید، عنوان: حیات، تحریر: ڈاکٹر مظفر عباس۔ ص 80
سر سید احمد خان نام سر خطاب تھا 17 اکتوبر 1817ء (۵ ذوالحجہ ۱۲۳۲ھ) کو دہلی میں پیدا ہوئے ان کا سلسلہء نسب امام نہم امام محمد تقی تک پہنچتا ہے اس لیے وہ تقوی سید کہلاتے تھے۔ سر سید کے بزرگ شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آئے اور ان کا تعلق ہمیشہ دربار سے رہا ان کا گھرانہ علم و فضل، رُشد و ہدایت اور حسب نسب کے لحاظ سے، ہمیشہ ممتاز رہا۔ سر سید کے داداجان فارسی کے شاعر تھے اور سر سید کے قول کے مطابق ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان سر سید کے والد سید متقی کی بھی مغلیہ دربار میں بڑی رسائی تھی۔ مولانا حالی نے ''حیاتِ جاوید'' میں سر سید کے حوالے سے لکھا کہ سر سید کہتے تھے۔۔۔
''میں بارہا اپنے والد کے ساتھ اور پھر تنہا بھی اِس خاص دربار میں گیا ہوں''۔
سر سید کے ننھیال کا تعلق میر درد کے خاندان سے تھا۔ اِن کے نانا خواجہ فرید الدین احمد، خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں سے تھے۔ غرض ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے سر سید نجیب الطرفین اور خاندانی تھے۔

حوالہ نمبر 2: کتاب ''چودہ ستارے''
مولف نورِ رخ یگانہ حضرت الحاج مولانا سید نجم الحسن کربلائی، ناظمِ اعلیٰ پاکستان مجلسِ علماء۔
عنوان: امام نہم کی ازواج اور اولاد، اور سادات رضویہ۔ ص نمبر 494,495
علماء نے لکھا ہے کہ حضرت امام تقی کی چند بیویاں تھیں جن میں اُم الفضل بنت مامون رشید عباسی اور سمانہ خاتون یاسر بھی نمایاں حیثیت رکھتی تھیں۔ جناب سمانہ خاتون جو کہ حضرت عمار

یاسر (رضوان اللہ علیہ) کی نسل سے تھیں، کے علاوہ کسی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ آپ کی اولاد کے بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ دو زینہ اور دو غیر زینہ تھیں۔ جن کے اسماء یہ ہیں

(1) حضرت امام علی تقیؑ

(2) حضرت جناب موسیٰ مبرقعؒ

(3) حضرت جناب فاطمہؒ

(4) جناب امامہ

امام نہم کی امامت کا سلسلہ امام دہم حضرت علی نقیؑ سے آگے چلا وہ سادات نقوی ہیں جبکہ علماء اس بات پہ متفق رائے رکھتے ہیں اور تمام مکتوبات کی چھان بین کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ ہشتم امام علی رضاؑ کی صرف ایک زینہ اولاد ہوئی جو نہم امام محمد تقیؑ ہیں لہٰذا جو امام نہم کی نسل آگے بڑھی وہ تقوی سید نہیں بلکہ اپنے دادا امام ہشتم کے نسب سے دُنیا میں آباد ہیں اور رضوی سادات کہلاتے ہیں

(ارشاد مفید ص نمبر 493، صواعق محرقہ ص 123، روضۃ الشہداء ص 438) اور دیگر کُتب وغیرہ شامل ہیں۔

حوالہ نمبر: 3 کتاب ''حیات جاوید''

مصنف: مولانا الطاف حسین حالی

عنوان: سرسید کی لائف تاریخ ولادت، خاندان، بچپن ص نمبر 46، 45، 44، 37، 30، 8، 26، 25، 15) یہ ضخیم کتاب جو 1901ء میں سرسید کے انتقال کے بعد شائع ہوئی، حالی کی سات سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ وہ اسے کئی سال سے مرتب کر رہے تھے لیکن اُنہوں نے کبھی سرسید کو نہ دکھائی اور نہ سرسید نے دیکھنے کی خواہش کی۔ جب سرسید کا انتقال ہو گیا تو حالی کو اس بات کا بڑا قلق ہوا کہ انہوں نے اس کا مسودہ سرسید کو کیوں نہ دکھایا تا کہ انہیں اندازہ ہوتا کہ اُن کے بارے میں کیا لکھ رہا ہوں۔

صالحہ عابد حسین

تاریخ ولادت اور خاندان:

سید احمد خاں 5 ذی الحجہ 1232ھ بمطابق 17 اکتوبر 1817ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ وہ باپ کی طرف سے حُسینی سید ہیں اُن کا سلسلہ نسب 32 واسطوں سے آنحضرت تک پہنچتا ہے اور جیسا کہ شجرۂ نسب مندرجہ خطباتِ احمدیہ سے پایا جاتا ہے اُن کے سلسلۂ نسب میں سے آخری امام محمد تقی ابنِ مُوسیٰ رضاؑ ہیں اور اسی لیے وہ اپنے تئیں تقوی سید کہتے تھے۔ جس زمانے میں کہ بنی اُمیہ اور بنو عباس کے ظُلم وستم سے عرب اور عراق عرب اور عراق میں رہنا دشوار ہو گیا تھا اور اِس لیے اکثر سادات کے خاندان وطن مالوف چھوڑ کر دُور دراز ملکوں میں جا رہے تھے اُسی پُر آشوب زمانے میں کسی وقت سر سید کے اجداد بھی دامغان میں جو ایران کا قدیم مشہور شہر ہے، چلے آئے اور آخر کار سہراب میں اُنہوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی غالباً اُن کے بزرگ ہندوستان میں پہلے پہل شاہجہان کے عہد میں آئے تھے اور اُس وقت سے لے کر اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک اُن کو اس سلسلہ عالیہ کے ساتھ برابر کسی نہ کسی طرح تعلق رہا ہے۔

سر سید کے والد "میر متقی" اپنی زندگی نہایت آزادی اور بے فکری سے بسر کرتے تھے جس کا اثر سر سید اور اُن کی اولاد میں اب تک بھی موجود تھا۔ اُن کو حضرت شاہ غلام علیؒ سے جنکی خانقاہ دِلی میں مشہور ہے، بیعت تھی اور شاہ صاحب اُن پر پدرانہ شفقت رکھتے تھے۔

سر سید کے ننھیال کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ "سیرت فریدیہ" ہیں جو خود سر سید نے اپنے نانا خواجہ فریدالدین احمد کے حالات میں لکھی ہے، درج ہے یہاں ہم اس کا خلاصہ ایک یادداشت سے جو سر سید نے "سیرت فریدیہ" لکھنے سے پہلے لکھوائی تھی، اخذ کر کے لکھتے ہیں:

"سر سید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد جو خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں ہیں۔ سر سید کی والدہ خواجہ فرید کی تینوں بیٹیوں میں سے بڑی تھیں اُن میں قدرتی قابلیت دیگر عورتوں سے بہت زیادہ تھی وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور ابتدا میں کچھ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی

پڑھی تھیں مگر اولاد کی تربیت کا اُن میں خداداد ملکہ تھا۔"

سرسید کہتے تھے کہ:

"میرے تمام ننھیال کو شاہ عبدالعزیز اور اُن کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو شاہ غلام علی صاحب سے بیعت اور عقیدت تھی۔ شاہ صاحب کے ہاں مَنت اور نذر و نیاز کا کہیں پتہ نہ تھا اُن کی عادت تھی کہ جب کوئی حاجت کی غرض سے پانی لے جاتا تو سب حاضرین سے کہتے کہ دُعا کرو خُدا اس کی حاجت پوری کرے یہی عقیدہ میری والدہ کا تھا۔"

سرسید کہتے تھے کہ:

"اُس زمانہ میں جبکہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا البتہ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ قرآن پڑھ کر بخشنے کا یا فاتحہ دِلا کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مُردہ کو پہنچتا ہے مگر میں اِن دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی میں تو میں نیابت مطلق کا قائل نہیں اور عبادت مالی میں بھی سوا اس کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کارِ خیر کے لیے کسی کے سپرد کر جانے اور کسی صورت میں نیابت کا قائل نہیں ہوں"۔

سرسید کا بچپن:

سرسید کے پیدا ہونے سے پہلے اُن کی بہن صفیہ النساء بیگم اور اُن کے بھائی سید محمد خاں پیدا ہو چکے تھے، سید محمد خاں کی ولادت کے بعد چھ برس تک اُن کے والدین کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے سید احمد خان کے پیدا ہونے کی اُن کو نہایت خوشی ہوئی۔

اِن تمام حوالہ جات کی روشنی میں جو نتائج اخذ ہوئے وہ یہ ہیں:

(1) سرسید احمد خاں کا نام "سید احمد خاں" تھا اور "سر" اُن کا خطاب تھا۔ جس کی وجہ سے وہ آج سرسید احمد خان کہلاتے ہیں۔

(2) اِسی طرح تمام شواہد کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ باپ کی طرف سے

"سید" تھے جبکہ وہ نجیب الطرفین سید نہیں تھے۔

البتہ نجیب الطرفین خاندانی تھے۔

(3) تاریخ شاہد ہے کہ سادات پر جس طرح ظلم ہوئے اور انہوں نے اپنے نام اور نسل کی بقا کے لیے جو اقدامات کیے اُن میں ایک ہجرت اور دوسرا اپنا مسلک اور عقائد چھپا کر رہنا تھا۔ سر سید کے ددھیال نے بھی یقیناً تکالیف کو برداشت کیا۔ یوں وہ اپنا نام اور نسل تو یقیناً بچا کر لے آئے لیکن اُن کے عقائد اور مسلک آئمہ طاہرین کی تعلیم کے خلاف ہمیں نظر آئے ہیں کیونکہ آئمہ کی تعلیم اور اس مسلک سے تعلق رکھنے والے اور اُن کی اولاد آج بھی نذر و نیاز کے مکمل پابند ہیں اور بیعت کا کوئی مفروضہ اُن کے مسلک میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اگر سر سید بھی انہی عقائد کے پیرکار ہوتے تو اُن کا نام آج "سر سید احمد خان" کی بجائے "سر سید احمد رضوی" لکھا اور پکارا جاتا۔

☆☆☆

باب دوم (ادبی کالم)

میں کیوں لکھتی ہوں۔۔۔۔؟

میں نے جب سے لکھنا سیکھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

پڑھنے لکھنے کا عمل انسانی وجود کے ساتھ ہی عمل میں آیا۔ علم سیکھنا شعور کا ارتقائی عمل ٹھہرا اس کے بغیر ایک بندہ انسانی شکل وصورت میں جمادات کی مانند ہوتا ہے آگہی کی اہمیت کا اندازہ کائنات کی سب سے مقدس کتاب کی نازل ہونے والی پہلی آیت مبارکہ ''اقرا باسمِ'' سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے مولائے کائنات نے فرمایا:

''کلام کرو تا کہ پہچانے جاؤ۔'' (نہج البلاغہ 392)

کلام صرف زباں وبیاں کا نام نہیں ہے بلکہ قلم کے ذریعے اپنی فکر کو آشکار کرنا ولیوں کا شیوہ رہا ہے۔ لکھنا کوئی فن نہیں یہ عطیۂ خُداوندی ہے یہ ہنر اگر آسان ہوتا تو دُنیا کا ہر شخص ہی ماہر قلمکار ہوتا۔ جب میری حقیرانہ ہستی ناسمجھی سے شعور کی دُنیا میں داخل ہوئی تو اپنی کچھ ناتواں سی آرزوئں، اپنی محسوسات کو ڈائری پہ رقم کرنا میری عادت بن گئی۔ پھر اس ڈائری کو کوئی پڑھ نہ لے اِسے کپڑوں میں چھپا چھپا کر رکھتی اور جب کبھی وہ ڈائری امّی ابّو کے ہاتھ لگ جاتی تو میں غصّے میں آ کر اِس کو نذرِ آتش کر دیتی یُوں ہر سال مَیں کئی ڈائریاں لیتی، لکھتی اور اِن کو چُھپانے کی ناکام کوشش کرتی مَیں نے دیگر لڑکیوں کی طرح کبھی مہنگے کپڑوں، جیولری، دوست بنانا، ہنگامہ، گھومنا پھرنا اِن سب کے نہ خواب دیکھے اور نہ کوئی شوق پالا، میں ہمیشہ پین (قلم) لینے، ڈائری لینے کا خواب دیکھتی اپنا زیادہ تر وقت تنہا گزارتی جس پر ابّو جی سے خاص طور پر ڈانٹ ملتی۔۔۔۔۔اور کہتے۔۔۔۔۔آدم بیزار مت بنو

۔۔۔اپنی محسوسات کو لفظوں کے ذریعے کاغذ پر ہی رقم کرتی جب کبھی میری کسی سینئر کو میرے جنون کا علم ہوتا تو وہ یہی کہتی ہاں وقتی شوق ہوتے ہیں یہ ڈائری کے بھی تُم بھی بھول جاؤ گی یہ سب۔۔۔اُن کے یہ الفاظ مجھے تیر بن کے لگتے اور کئی کئی دن میں اِسی کرب میں رہتی اور دُعا کرتی یا اللہ مجھے کاغذ قلم سے بے پناہ عقیدت ہے خُدایا مجھ سے یہ سب کبھی مت چھیننا یہ میری قوت گویائی ہے پھر زندگی کے تلخ لمحے بھی آئے وقت کے بے رحم ہاتھوں کی چپیڑیں جب میری روح کے رُخساروں پہ پڑیں تو مَیں نے اپنے درد کو لفظوں کی زبان دینا شروع کی نہ جانے کب اور کس وقت میرے لکھے نے مجھے باادب بننے کی لائن میں کھڑا کر دیا اور آج میں صرف اِس سوچ سے لکھ رہی ہوں کہ خود کو اِس اہل بنالوں کہ ادب کے سمندر میں اِک قطرہ بن کر ضم ہو جاؤں۔بس یہی اِک خواہش اب بے حساب ہے۔

☆☆☆

مصنوعی محبت

آج کے اِس مصروف ترین دور میں جہاں زندگی سیکنڈ کی رفتار سے سفر طے کر رہی ہے۔ جہاں سوشل میڈیا کی اِس تیز گام ریل میں سفر کے دوران ساری دُنیا سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آ گئی ہے وہیں قریب تر رہنے والوں سے دوری کی بڑی وجہ بھی بن گئی ہے احساس کی قلت اور جذبہ ءِ دل کی سرد مہری چار سو دِکھتی ہے اس نفسا نفسی کے عالم میں جس چیز کی شدت ملتی ہے وہ مصنوعی محبت کا وجود ہے اپنے رشتوں سے ناخوش

اور نت نئے رشتے بنانے کی جستجو آج کے دَور کے آدمی کا خاصہ بن چکی ہے فطری طور پہ وجودِ بشر شدت پسند واقع ہُوا۔ تبھی اِس کی راہنمائی کے لیے اصول وضوابط کا پابند ہونے کا دعویدار بھی بنتا ہے اور خلاف اصول کام بھی اِسی کا خاصہ ہیں۔ اپنے محرم اور جائز رشتوں سے بیزاری جتا کر نامحرم سے ناجائز رشتے بنانے اور نبھانے کی ٹوہ میں لگا ہے اور انہی سے سکونِ قلب اور دستِ شفقت کا متقاضی ملتا ہے۔ یہ صرف آج کی نوجوان نسل کا المیہ نہیں بلکہ اِس میں شامل ہر عمر اور نسل کے لوگ ہیں جنہوں نے محض اپنی جنسی ضرورت پوری کرنے کے لیے اپنی اندرونی جہالت کو چھپانے کے لیے محبت، دوستی جیسے پاک رشتوں اور جذبوں کو رُسوا کر رکھا ہے اور اپنی پست فہمی کی بناء پر خود کو مفقود الجنس قرار دیا ہے یہی معاشرے کے آج انتشار کی سب سے بڑی وجہ بن چکی ہے جس کی اصلاح ہمیں اپنے آپ سے ہی کرنا ہوگی ورنہ ماتھے پہ محراب سجے ہوں یا پھر چاہے پچیس ہزار کُتب کا مطالعہ کیا ہو جب تک مصنوعی محبت کا جالا دِل و دماغ پہ تنا ہے سب لاحاصل ہے۔

☆☆☆

قتلِ عمد

احساس اور آدمیت کے جذبے کی بنا پر بندوں کو دوسری جنسوں پر برتری دی گئی اور یہی جذبہ ہی حقانیت کی آواز بنتا ہے اور قریب الٰہی کا موجب بھی۔

اسی جذبے کے زیرِ اثر معاشرے میں فلاح و اصلاح کی فکر وجود میں آتی ہے اور جُدا جُدا طرز پہ اس کو عملی شکل دی جاتی ہے اِن میں سے ایک عمل معالج طبقہ کا ہے جو اپنے آپ کو کارِ خیر کی بنیادی اکائی گردانتے ہیں اور ہو بھی سکتے ہیں۔۔۔مگر خلوصِ نیت شرط اولین ہے کیوں نہ ہو جب ''عملوں کا دارومدار ہی نیتوں پر ہے'' آج کے اس مردہ آدمیت کے دور میں شاذ و نادر ہی ایسی صفات کا معالج آپ کو ملے گا جس میں خلقِ خُدا کی خدمت کا جذبہ ہو دُنیا بٹورنے کے چکر میں اور اپنا معیارِ زندگی بُلند رکھنے کی چاہ نے اُنہیں اِس قدر اندھا بنا ڈالا کہ شب و روز کی الگ الگ نشستوں کے معالجہ کی رقم بھی منفرد مقرر کی گئی ہے اور رقم کی ادائیگی کے بعد ہی اِن کو معالج کی دومنٹ شکل دیکھنے کو ملتی ہے۔اِن کا خاص نمائندہ ہی اِن کے اِس فعل کو انجام دیتا ہے گائنی ہسپتال جو کہ اب بیوٹی پارلر کی طرح ہر محلے میں سہولت سے موجود ہیں مگر یہاں صرف پیسہ ہی بولتا ہے آنکھوں دیکھا حال آپ کو آج سنانے چلی ہوں۔اِک چھ ماہ کی حاملہ لڑکی جو کمزور طبعیت ہونے کے باعث دیوار کا آسرا کبھی اپنی ماں کا سہارا لے کر انتظار گاہ تک پہنچی وہ معمول کا معائنہ کروانے گھر سے نکلی تھی تین ڈاکٹروں کی کلینک پر گئی مگر سب کو موجود نہ پا کر آخرش مشہور و معروف کلینک پر پہنچی، پیاس سے نڈھال تھی وہاں پر موجود پانی والے کولر کی حالت اندر کی باہر والی سے بھی بدتر تھی اس میں اگر کسی جانور کو پانی پلانا پڑ جاتا تو بھی اس کی صفائی کا خیال رکھا جاتا ٹوائلٹ کی بدبو سے اِسے متلی ہونے لگی وہ اِک لمحہ یہاں بیٹھ نہ پائی اور دیوار کا سہارا لے کر باہر کی گیلری میں ٹھہر گئی۔پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں ہے۔اس کے بعد وہ آدھا گھنٹہ آرام کریں گی

پھر نماز کا وقفہ ہوگا اور اس کے بعد اُنہوں نے آنا ہوا تو آئیں گی، ورنہ نہیں یہ سب سُن کر اس نے ملتجی انداز سے نرس سے کہا سسٹر بات سُنیں آپ براہِ مہربانی ڈاکٹر سے پوچھ لیں ہم دور سے آئے ہوئے ہیں اس نے دلاسہ دیا اور چلی گئی اِسی دوران دو اور عورتیں بھی اس کی شریک راہ ہوگئیں پانچ منٹ کے بعد وہ نرس واپس آکر اعلانیہ انداز سے بولی جس جس نے اپنا معائنہ کروانا ہے وہ ڈبل فیس پر کرواسکتا ہے اور ادویات بھی ہمارے ہی سٹور سے ملیں گی ایک ہزار معالج کی فیس اور سٹور کی دوائی تین ہزار ٹوٹل جمع کروادیں اگر منظور ہے تو بیٹھیں ورنہ چلے جائیں یہ سُن کر اِس پہ تو سکتہ طاری ہوگیا کیونکہ اِن کے پاس اس وقت کُل ایک ہزار تھا۔اس کی والدہ نے آگے بڑھ کر نرس سے بات کی کہ ہمارے پاس رقم کم ہے، ہم ادویات کل لے جائیں گے آپ مہربانی کر کے صرف چیک اپ کروادیں مگر وہ پتھر کی طرح ٹس سے مس نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اتنا بھی اُسے کہا کہ ہمارا شناختی کارڈ بطور امانت رکھ لو، ہم کل آکر لے جائیں گے۔ مگر وہ نہ مانی اور ہر بار کہتی رہی تُم لوگ کل آجانا۔۔۔اور وہ بیچاری دو گھنٹے یہاں پر بھی تکلیف سہنے کے بعد خالی واپس چلی گئی۔وہ درد سے کراہ رہی تھی ٹھہرنے کے باعث اُس کے پاؤں پر سوزش ہوچکی تھی اور نہ جانے اُس پر آگے کیا گزری ہوگی۔

یہ سارا تماشہ دیکھنے کے بعد میرا دِل و دماغ غم و غصّے میں ڈوب گیا اور کئی سوالوں نے میرے دل و دماغ کے اندر ارتعاش پیدا کر دیا۔ستر ہزار ایک آپریشن کی فیس اور چھ ہزار دو مریضوں سے لے کر جیب میں رکھنے والی ڈاکٹر کی باقی دن کی کمائی تو گنتی نہ کریں اگر صرف ایک مریض آج فری بھی چیک کر لیتی تو کیا جُرم ہو جاتا، کیا کمی آجاتی۔کیا یہی خدمتِ خلق ہے اس لڑکی کے ساتھ اگر کچھ بُرا ہو گیا ہو تو اس کا ذمہ دار کون ہے۔۔۔یہ قتلِ عمد ہے۔۔۔ ؟اور قاتل سرِعام معتبر بن کر پھرتے ہیں۔

☆☆☆

عاشور کا دن گر نہ ہوتا

تاریخِ انسانی ہزار ہا صدیوں پُرانی ہے ہر دور نے زندگی گزارنے کے لیے مختلف اقدار کو متعارف کرایا۔۔۔۔لیکن اِن تمام ادوار میں حقانیت کی تعلیم مسلسل جاری رہی جو کہ اِس کے برگزیدہ بندوں نے سرانجام دی وہ برگزیدہ بندے رب کے بھیجے گئے خاص نبی، پیغمبر اور رسول ہیں۔جن کی تعداد کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے اِس سلسلہ نبوت کی آخری کڑی سرکارِ دو عالم ختم المرتبت سید المرسلین آقا حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دُنیا سے پردہ کرجانے کے بعد ضرورت اِس بات کی تھی کہ رب کی حقانیت کا بول بالا تا ابد یونہی قائم رہے اور رب کی طرف سے دی گئی تعلیمات کے مطابق ہی لوگ اپنی زندگیاں بسر کرتے رہیں۔جہالت کی تاریکیوں میں ہر نبی کی قوم کی طرح ڈوب کر عذابِ الٰہی کی مرتکب نہ ہو جائیں حلال وحرام کی تمیز قائم رہے اور اپنی وجہِ تخلیق کو سمجھیں کہ رب نے اِن کو اشرف المخلوقات بنایا ہے نہ کہ جانوروں کے ریوڑ کی طرح دُنیا میں آئیں کھا پی کر دُنیا دیکھ کر اور اِس کی پستی میں ڈوب کر ہی بس مرجائیں۔۔۔۔اِن تمام امور کے لیے صرف قرآنی تعلیمات ہی کافی نہ تھیں تبھی اللہ پاک نے اہلِ بیتِ اطہارؑ کا وجود ساتھ خلق فرمایا تا کہ میرے بندے اپنا حقِ بندگی میرے بتائے گئے اصول وضوابط میں رہ کر ادا کرسکیں اور اشرف المخلوقات کہلانے کے لائق بن سکیں۔

آدمیت کے وجود نے ازل سے ہی حق وباطل کا وجود جنم دے دیا تھا جس نے نیکی بدی کی راہ مقرر کر دی بعدِ سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جہاں دینِ نبوی میں بے حساب تبدیلیاں لائی گئیں وہاں اہلِ بیت اطہارؑ کے اوپر بے شمار مظالم بھی ڈھائے گئے اِن کی عزت وتکریم بُھلا دی گئی جن کی مودت کے بغیر دینِ اسلام پر اعتقاد رکھنے والے کا

ایمان کبھی مکمل نہیں ہوتا اور اِس کا نتیجہ 61 سنہ ہجری کو واضع طور پر سامنے آ گیا۔

جب یزید ابنِ معاویہ بر سرِ اقتدار آیا اِس نے سوالِ بیعت سردارِ جنت آقا و وارثِ دینِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے کیا جن کے لیے آقائے دو جہاں (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے کبھی خود کو سواری بنایا تو کبھی اِن کی پُشت پر آ جانے سے اپنے سجدوں کو طول دے دی اور بار ہا فرمایا:

"الحسینؑ و منی وَ اَنَا من الحسین"

وارثِ انبیاءؑ کے انکار پر اُنہیں اپنے تمام اہل و عیال سمیت جلاوطن کر دیا گیا۔ 28 رجب کو آقائے دو جہاں کے پھول و کلیاں رختِ سفر باندھ کر روضہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اپنے نانا پاک کو الوداعی سلام کر کے مدینہ سے روانہ ہوئے 8 ذالحج کو جب تمام مسلمان حج کے لیے مکہ جمع ہو رہے تھے شام کی فوج حاجیوں کے بھیس میں تلواریں لیے حرم میں آ پہنچیں تا کہ دورانِ حج امامِ دو جہاں مولا حُسینؑ کو شہید کر دیا جائے جب آپ کو خبر ملی تو آپ نے حج کا ارادہ ترک کرتے حج کو عمرہ میں تبدیل کیا کیونکہ آپ توحید کے پاسباں تھے کعبہ ءِ خُدا کی حُرمت اور تقدس کو آپ نے بچایا آپ اپنے اہل و عیال جس میں معصوم بچے بھی شامل تھے لے کر عراق روانہ ہوئے۔ دو محرم کو آپ سرزمینِ نینوا پر پہنچے جہاں آپ نے اپنے خیام دریائے دجلہ و فرات کے درمیان نصب کیے۔ یہاں یزیدی فوج نے آ کر آپ کا محاصرہ کر لیا۔ سات محرم کو آپ کے خیام وہاں سے ہٹا دیئے گئے اور آپ پر پانی بند کر دیا گیا۔ دس محرم روزِ عاشور تمام مظالم کی حد ختم کر دی گئی۔ آپ نے بہتر قربانیاں دینِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی حُرمت و استقامت تا ابد قائم رکھنے کے لیے پیش کیں۔ اِن میں نوے سالہ ضعیف صحابی بھی تھا اور چھ ماہ کا شیر خوار بیٹا بھی! اگر یہ صرف جنگ ہوتی تو محض ہار جیت پہ ہوتی اور اصول و ضوابط کے مطابق ہوتی مگر یہ محض جنگ کی شکل دے کر نسل کشی ءِ پیغمبر تھی اور بعدِ عاشور اگر یہ جنگ ہوتی تو وہ تو سیاہ یزید سب کو قتل کر کے جیت چکی تھی پھر نبی زادیوں کو قیدی بنا کر سروں سے ردائیں چھین کر شہر بہ شہر بازاروں اور درباروں میں پھرانا کون سے مذہب میں یہ قانون آج تک ملتا ہے ۔۔۔؟ کہ

عورتوں اور بچوں کی عزت وتکریم ہر حال میں رکھی جاتی ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں تاریخِ آدمیت میں اگر عاشور کا دن نہ ہوتا تو دُنیا کبھی حق و باطل کی تمیز ہی نہ کر پاتی ہر طرف بدی ہی بدی ہوتی ۔حلال وحرام کیا ہوتا۔۔۔؟ کون جانتا۔۔۔؟ تبھی لاکھ مخالفتوں اور بے شمار مظالم کے باوجود بھی عاشور ایک روز کا صدیوں پہ چھا گیا اور حق آج بھی سر بلند ہے چاہے باطل نے جتنا اِس کو دبایا۔

وَمَا علینا اِلا البلٰغ المبین۔

☆☆☆

سستی شہرت

آج کے مصروف ترین دور میں جہاں ہر شخص کی اپنی ایک الگ دُنیا ہے وہاں وہ خود پرستی کی بیماری میں بھی بُری طرح سے مبتلا ہے سوشل میڈیا کے اِس دور نے آدمی سے نہ صرف اس کی آدمیت چھین لی بلکہ اُسے حیوان صفت درندہ بنا ڈالا ہے جہاں وہ اپنی نمائشی غرض آلود صحرائی دُنیا میں شب و روز مقید ہے اس خستہ حال دور فقدانِ آدمیت میں ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ تمام سخوران جہاں اپنا فریضہ نبھائیں جس طرح تاریخ میں اہلِ قلم نے ہی اپنی قلم کے ذریعے انقلاب برپا کئے اپنی قدروں کو زندہ رکھا اپنے دور کو قرطاس و قلم سے موجودہ دور تک پہنچایا وہاں آج مردہ انسانیت کو زندہ کرنے کے لیے اِنہی قوی دست اہلِ قلم کا فقدان نظر آتا ہے۔ المیہ ادب میں یہ ہوا یہاں بھی مچھلی منڈی کی طرح ادباء و شعرا کی لمبی فہرست تو موجود ہے مگر اِن میں کوئی لوئس الیگزینڈر، نپولین، سعدی، رومی، شیرازی، علی شریعتی، سر سید، اقبال، جوش، نصیر ترابی، فیض و دیگر کارفرما جنہوں نے آدمیت کو بیدار کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا اور کر رہے ہیں ماسوائے چند جن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔۔۔ یہاں کی صورت حال بھی معاشرے سے قدرے جُدا نظر نہیں آتی۔ سوشل میڈیا پہ سیلفی، ویڈیوز، پوسٹیں، سٹیٹس کے بعد میڈیا کی خبروں کا حصہ بن کر اور اپنی چودہ کُتب چھپوا کر مارکیٹ کی زینت بنا دینا ہی آج کے بنے شاعر و ادیب کے نزدیک ادب کی بڑی خدمت کرنا ہے کیا اِس طرح ہی معاشرے کی اصلاح ممکن ہے۔۔۔؟ کیا یہ فکری انارکی کو روکنے کا سبب ہے۔۔۔؟ کیا بے عمل معاشرے میں بڑھتے جنسی میلانات کو روکنے میں معاون ہو پائے گا۔۔۔؟ کہیں آپ کا قلم اور فعل ہی تو اس کی شہرت کا سبب نہیں۔۔۔؟ اِس شہرت پرستی کی غرض نے ہی تو متشاعر اور قلم چھاپوں کی منڈی لگا دی ہے اور گھر بیٹھے چلتے پھرتے طوائف پیدا کر دیئے۔۔۔ اِسی سستی شہرت نے ہی آدمیت کو ناشُردہ کر ڈالا۔ شاید غالبؔ نے اِسی لئے فرمایا تھا کہ:

بسکہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

☆☆☆

ادب کی خستہ حالی

ادب عربی زبان کا لفظ ہے اور مختلف النوع مفہوم کا حامل ہے۔ اس کے لفظی معنی قاعدہ، قرینہ، طریقہ، عجز و نیاز، حیا، شرم و خاکساری کے ہیں۔ لغوی معنی ''کسی چیز کو حدِ نگاہ میں رکھنا '' جبکہ اصطلاح میں اس سے مراد زبان و بیان کا علم ہے جس میں علوم و فنون، قدریں اور اصنافِ سخن شامل ہیں۔ ادب کی تعریف ہر زبان کے مورخ اور دانش مندوں نے اپنی زبان میں کی۔ دنیا میں بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں ہر زبان کی اپنی تہذیب و ثقافت رسم و رواج ہیں اپنی پہچان اور شناخت کو قائم رکھنے کے لئے ماضی و حال کے تمام فنون لطیفہ و علوم کو وہاں کے مورخ، دانشور، شاعر، ادیب اپنے رنگ میں محفوظ رکھتے ہیں۔ زمانہ قدیم سے جب سے عقلِ آدمی میں شعور آیا تو ادب کا وجود بھی وقوع پذیر ہو گیا۔ ہر گزرتے دور کے ساتھ ساتھ اس میں بھی اتار چڑھاؤ آتے رہے۔ مگر جتنا ادب کے اندر دھاندلی اور غیر معیاری کام اکیسویں صدی میں ہو رہا ہے ایسا شائد پہلے کبھی نہیں ہوا۔ بر اکثر شاعر و ادیبوں کی بھر مار ہے۔۔ ایک ہی علاقے میں ہر محلے میں نئی ادبی تنظیم ہے۔ جبکہ وہاں صرف منافقت اور تخریب کاری کا اجتماع ہوتا ہے۔ ''میں'' کی توصیف و تعریف اور دوسرے کی غیبت و برائی کا عمل نہایت اہتمام سے ہوتا ہے۔ صرف تصویری جھلکیاں ہی لائقِ ستائش ہوتی ہیں کسی کو شائبہ تک نہ ہو یہاں کس تحریک کو عمل میں لایا جا رہا ہے۔ مرد حضرات کا اپنی کولیگ خواتین پر آپس میں جملے کسنا ان کو اپنی گفتگو کا موضوع بنانا اپنے نام کے ساتھ منسوب کر کے باتیں کرنا کیا یہ اخلاقیات و ادب کی حدود ہیں؟ اور یہ کس ادب کی ترویج کے لئے کام ہو رہا ہے؟ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں جتنے انقلاب رونما ہوئے اُن میں ادباء و شعراء نے کیا خدمات انجام دیں؟ اور کس طرح اپنی قلم کی طاقت سے تلوار کا کام لیا

آج گنتی کے چند ادباء میں بس وہی جذبہ اور عزم ملتا ہے۔ باقی تو شہرت و دنیا کی حوس میں غرق۔ حد تو اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب ایک شاعر، ادیب اہلِ قلم اور معاشرے کی اصلاح وفلاح کا دعویدار ہی معاشرے میں پھیلتی بے راہ روی اور جنسی میلانات کا مرتکب ملتا ہے پھر بھلا وہ اس کی روک تھام کے اسباب کہاں سے پیدا کرے گا؟ اور کیا قلم کی حرمت کا وہ امین ہے؟ جو اپنی حرمت نہ بچا سکے اور حلال وحرام کی تمیز تک نہ کر سکے وہ آدمی کے روپ میں حیوانوں سے بھی بدتر مخلوق ہے۔ ایسے دانشوروں اور ادیبوں سے کیسے انقلاب کی توقع رکھی جا سکتی ہے؟ عقل ماؤف ہے۔۔۔

☆☆☆

کرونائی دور اور ادب

دنیا میں بے شمار مخلوقات آباد ہیں ان کی سکونت کا عمل صدیوں پر محیط ہے ان تمام مخلوقات میں اشرف المخلوقات ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے حساس مخلوق حضرتِ انسان ہے۔ 2019ء کے اواخر میں کرونا وائرس نامی بیماری سے پہلا متاثرہ شخص چین کے شہر ووہان میں رونما ہوا اس بیماری کو کووڈ 19 کا نام دیا گیا۔ یہ دیکھتے ہی دیکھتے چند دنوں میں بڑھ کر عالمی وباء کی شکل اختیار کر گئی، گویا اس وبا نے اقوام عالم میں جنگل میں آگ کا کام کیا۔ اس وباء نے دنیا میں ہر طرف خوف و ہراس کی لہر دوڑا دی۔ مرض کی شدت قریباً اڑھائی برس کی طویل مدت تک رہی ہے تا حال یہ موجود ضرور ہے مگر اس کی بھیانک صورت حال پر ممکنہ حد تک قابو پا لیا گیا ہے۔ وباء کے زیرِ اثر جہاں ساری دنیا کا نظام اور انسانی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی، وہاں اس نے دنیا بھر کی ہر زبان و ادب پر بھی اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اس نے دنیا میں کئی نئے لفظ متعارف کروائے۔ جن میں قرنطینہ، لاک ڈاؤن، سماجی فاصلہ، سینیٹائزر، وغیرہ ایک اندازے کے مطابق ان الفاظ کی تعداد انیس کے قریب ہے۔ جو 2020 میں متعارف ہوئے۔

اس وبائی اور خوفناک دور نے دنیا کے ہر گوشے میں بیٹھے شاعروں، ادیبوں، دانش مندوں کو الیکٹرانک میڈیا پر متحرک رکھا۔ عوام الناس کو اس پر آشوب دور اور ذہنی تناؤ سے نکالنے کے لئے انہوں نے اپنے فرائض بخوبی نبھائے۔ اپنی تحاریر کی صورت میں تمام تر واقعات و حقائق کی عمدہ عکس بندی پیش کی۔ اِن میں ناول، افسانے، افسانچے، نظمیں، غزلیات، قطعات و اشعار کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن شامل ہیں۔ اس تلخ ترین دور نے دنیا سے کئی ادبی ہیروں کو چرا کر موت کی آغوش میں سلا دیا یہ خسارہ ادب کے لئے نا قابلِ تلافی نقصان ہے مگر دنیا کا کارواں اپنی ڈگر پر قائم ہے اور یہی قانونِ قدرت ہے۔

☆☆☆

باب سوم (تبصرہ جات کتب)

گوش بر آواز

بھارت کے شہر کلکتہ سے تعلق رکھنے والے مشہور شاعر، صحافی، کالم نگار بیشتر کُتب کے مئولف و مصنف اور ''پیامِ مشرق'' کے منتظمِ اعلیٰ مشتاق دربھنگوی نے اپنی انتھک محنتوں اور کاوشوں سے منفرد و لازوال کام کرنے کی ٹھانی۔ عالمی سطح پر اُردو ادب سے تعلق رکھنے والے شعرا و شاعرات کی ڈائریکٹری ''گوش بر آواز'' کے نام سے مرتب کی۔ جس میں ایک اندازے کے مطابق تقریباً3343 شعراء و شاعرات کا کلام یکجا کیا گیا۔ اِس ڈائریکٹری کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے دس جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ اس ضخیم ڈائریکٹری کو اُردو کی عالمی ویب سائٹ ''ریختہ'' پر بھی محفوظ کیا گیا ہے۔ جہاں بھر سے اُردو ادب سے شغف رکھنے والے تمام افراد اس عظیم ادبی کاوش پہ اُنہیں ڈھیروں داد و تحسین پیش کرتے ہیں اور اِن کی ادب دوستی کو سلام پیش کرتے ہیں۔ آپ کی یہ سعی اُردو ادب کی ترویج میں معاون ثابت ہوگی۔ دُعا ہے کہ آپ کا یہ ادبی سفر یُوں ہی رواں دواں رہے گا۔۔۔ (آمین)

☆☆☆

''پہلا چہرہ'' کے خالق

جس شاعر و سُخن شناس شخصیت پہ قلم فرسائی کرنے کی جسارت کر رہی ہوں میرے لیے مخلص راہنما، والد بزرگوار کی جگہ ہیں۔ ہر شخص کے لیے اور ہر شخص پہ قلم اُٹھانا آسان نہیں ہوتا۔ یہ مجھے ''پہلا چہرہ'' پڑھنے کے بعد قربان صاحب کے حکم کی تعمیل کرنے پر اندازہ ہُوا۔ سادہ لوح طبعیت کے مالک اپنے نام اور کام میں بے مثال ادبی قد آور شخصیت، منفرد اسلوب کے شاعر ہیں ''پہلا چہرہ'' کا نمائندہ شعر ملاحظہ ہو۔

یوں تو دُنیا میں دیکھے ہیں لاکھوں ہی چہرے
یہ ''پہلا چہرہ'' ہے جو دِلرُبا سا لگتا ہے

شاعری کا یہ مجموعہ آپ کی پہلی شعری کاوش ہے۔144 صفحات پر مشتمل شعری مجموعہ ''پہلا چہرہ'' میں مناجات، نعت عاشور، نوحہ، ماں، حُب الوطنی، غمِ دوراں و غمِ جاناں اور کہیں کہیں محبت کے گیت ملتے ہیں۔ ہر نیا صفحہ پلٹنے پر نئے موضوع سے ملاقات ہوتی ہے اور لفظ لفظ اپنے اندر بلا کی گہرائی سمیٹے ہوئے ہیں۔

زندگی
زندگی شراب ہے
پیتے ہیں تو تلخیاں
نہ پئیں عذاب ہے
زندگی خراب ہے
زندگی عذاب ہے

خوب صورت اچھوتے الفاظ کا چناؤ قوسِ قزح کے سارے رنگوں سے لپٹے آپ کے حرف اور اسلوب کی جدت آپ کو دوسرے شعراء میں ممتاز کرتی ہے۔ ایک شاعر جو اپنے درد

وغم جمع کر کے اپنی قلم تمام تر محسوسات کا تنکا تنکا جوڑ کر دِل کے لہو میں اپنی قلم ڈبو کے کاغذ پر حرف کی صورت رقم کرتا ہے تو وہ حرف لفظوں کی صورت زندہ وجاوید ہو جاتے ہیں۔ایک پُختہ قلم کار کی قلم کا جادو یہی ہوتا ہے کہ اس کے لفظ پہروں خرد کی دیواروں پہ رقم رہیں اور من جھوم جھوم کر اِن کا ورد کرتا رہے۔ یہ تمام تر خوبیاں اِن کے کلام میں ملتی ہیں۔میری کم فہمی تو شاید اِک حرف کا بیاں بھی ادا نہ کر پائے مگر میں آپ کی اِس عظیم ادبی کاوش کو سلام پیش کرتی ہوں اور دُعا گو ہوں کہ آپ کا سایہ ہم پر تادیر شجرِ سایہ دار کی طرح قائم رہے۔۔۔(آمین)

☆☆☆

خیالی کے حقائق

جسارت خیاؔلی کا تعلق لیہ کی زرخیز ادبی زمین سے ہے علم وعمل سے وابستگی نے آپ کو ایک ماہرِ سخن شناس بنا دیا۔ آپ ایک معتبر ادیب اور شاعر کی صورت میں علمی وادبی حلقوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ حال ہی میں آپ کا شعری نسخہ ''غالب کے نقشِ قدم پر'' منظرِ عام پر آیا۔ جس میں آپ نے غالب صاحب کی زمینوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ جس کو پڑھ کر قاری پہ خیالی کا تخیل وحقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ کس قدر مشقِ سخن رکھنے والے ادب شناس ہیں۔ ایک سو بارہ صفحات پہ مشتمل آپ کی یہ ادبی کاوش آپ کی فنی مہارتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے آپ نے جب غزلیات کی زمین کو برتا ہے جن میں اکثریت اُس کلام کی ہے جس کو محبانِ غالبؔ اپنا اوڑھنا بچھونا رکھتے ہیں۔ یہاں چند اشعار غالب وخیالی کے پیش کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

راشتی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دِل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
(غالب)

اشک روکو نہ ندامت کے اثر ہونے تک
داغ دامن کے ہی ڈھل جائیں سحر ہونے تک
(خیاؔلی)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دِل جگر تشنہ فریاد آیا
(غالبؔ)

جب کبھی زخمِ جگر یاد آیا
پھر ترا تیرِ نظر یاد آیا
(حالؔی)

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں
(غالبؔ)

جو سچ خونِ دِل سے ہی کرتے رقم ہیں
یہاں ہاتھ اُن کے قلم دیکھتے ہیں
(خیالؔی)

اس طرح کے بے شمار اشعار ہمیں غالبؔ اور خیالی کے خوبصورت الفاظ کی ہم آہنگی میں ملتے ہیں۔خیالی نے غالب کی زمین پہ کام کرنے کی یہ کاوش جدید تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کی ہے۔یہ عمدہ کاوش اُردو ادب سے رغبت رکھنے والے قارئین کے لیے عمدہ تحفہ ہے۔

☆☆☆

نثری ہائیکو کی پہلی شاعرہ

انیلا طالب کا شمار نسائی ادب میں اُن قابلِ رشک لکھاریوں میں ہوتا ہے جنہوں نے نہایت ہی کم عرصے میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دِکھلا کر اپنی ہستی کو منوایا ہے عہدِ کم سنی سے ہی ادب سے رغبت آپ کو اپنے علمی وادبی گھرانے سے ورثے میں ملی۔ سادات گھرانے کی نسبت نے آپ کی طبیعت میں تصوف کا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ جس کی نمایاں جھلک آپ کے کلام میں جابہ جا ملتی ہے محبتِ الٰہی ومحبوبِ الٰہی کا ذکر ثنائے پنجتن پاک ہی آپ کا موضوعِ سُخن ہے۔ آپ کا کلام عشق مجازی سے نا آشنا لگتا ہے آپ کا پہلا مجموعہ ''چھولو آسمان'' ہے یہ نثری مجموعہ ہائیکو چھیانوے صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں '' طالب حق'' کے عنوان سے آپ کی محسنہ محترمہ نزہت اصغر اپنے اظہارِ خیال میں کہتی ہیں کہ:

''انیلا طالب نوجوان خواتین شعراء میں ایک قابلِ غور، قابلِ فخر اور دلکش اضافہ ہیں۔''

آپ کے کلام میں فلسفہ حیات اور عشقِ حقیقی اور مناظرِ فطرت سے گہری رغبت ملتی ہے۔ شاعری میں جدت کا عکس بھی ملتا ہے۔ روحانی طور پر آپ ارفع کریم سے والہانہ عقیدت رکھتی ہیں۔ اُنہیں اپنا آئیڈیل گردانتے ہوئے اپنی تمام کامیابیاں اُن کے نام منسوب کرتی ہیں۔ آپ نہ صرف ایک شاعرہ ہیں بلکہ پُختہ ناول نگار اور افسانہ نگار بھی ہیں۔

ادبی رسائل وجرائد اور ڈائجسٹ اِس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔اُردو نثر ہی آپ کی پہچان کا مکمل حوالہ ہے۔آپ کی پانچ کتب اس وقت منظرِ عام پہ آچکی ہیں۔انیلا طالب کی علمی و ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں مختلف علمی و ادبی تنظیموں کی جانب سے بے شمار اعزازات سے نوازا گیا ہے۔آپ اِس وقت چون سے زائد ممالک کی ادبی ممبر شپ ہولڈر ہیں اور اپنے ملک وقوم کی نمائندگی کر رہی ہیں۔2018ء میں شائع ہونے والے آپ کے ہائیکو مجموعہ ''چھولو آسماں'' کو اُردو ادب کا پہلا نثری ہائیکو مجموعہ قرار دیا گیا ہے۔اُمید ہے کہ ادب کی یہ کلی جس لگن سے ادب کی خدمت کرنے میں سرگرداں ہے اپنی فکری و فنی صلاحیتوں سے ادب کی آبیاری کرنے میں بہترین خدمت گار ثابت ہوں گی۔

''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''

☆☆☆

نظم آراستہ اور گل بخشالوی

گُل بخشالوی کا نام اُردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ''نظم آراستہ'' 2019ء میں شائع ہوئی۔ اِن کی بے شمار تصانیف و تالیف کے مجموعوں میں قارئین کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہونے کے ساتھ ساتھ ادب میں ایک خوبصورت اضافہ بھی ہے۔ آپ کے تمام مجموعے اُردو ادب کی تاریخ میں خوب صورت اضافہ ہیں۔ ''نظم آراستہ'' جیسا کہ اپنے نام کے اندازِ بیاں سے ظاہر ہے۔ اس میں شامل شعراء کا منظوم کلام حروفِ تہجی کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔ کتاب کو جدید فنی لوازمات سے آراستہ کیا گیا ہے۔ بخشالوی صاحب کی ادب دوستی و عقیدت مندی، ادب سے والہانہ محبت کا انداز اُن کی پینتیس سالہ ادبی خدمات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے اس محسنِ ادب شخصیت کی کمال ادبی خدمات لائقِ صد تحسین ہیں۔ اِن کی ادبی خدمات پر ایم فل کا مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔ آپ کی مادری زبان پشتو ہے لیکن اُردو سے آپ کو والہانہ محبت ہے۔ بخشالوی صاحب نہ صرف ادب دوست بلکہ ایک مخلص، ادب شناس شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ اُردو زبان و ادب سے والہانہ عقیدت اِن کے اِس مقبولِ عام شعر سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔

ادب دوستی ہے ادب کی بہاریں
زبانوں میں اپنی زباں کو نکھاریں
قلم قافلہ میں محبت قلم سے
چلو اُردو کی زُلفیں سنواریں

گل بخشالوی کی یہ روشن خیالی اور مثبت اندازِ فکر اِن کو اپنے ہم عصر میں نمایاں مقام عطا

کر رہی ہے۔ہم اِن کی ادبی خدمات کو سلام پیش کرتے ہیں اور دُعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت اِن کا سایہ تادیر اُردو ادب کے سر پر سلامت رکھے اور یونہی گل بخشالوی اپنے قلم کی نوک کے ذریعے اُردو کی زُلفیں سنوار کر اپنی آنے والی نسلوں کے قلب واذہان میں ودیعت کرتے جائیں۔آپ نے اپنے حصّے کا جو دیپ جلایا ہے وہ آج روشن چراغ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اِس کی روشنی کے سبب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ دُنیا بھر سے اُردو ادب کے تمام ستارے ایک کہکشاں کی صورت تالیفی مجموعے میں جگمگا رہے ہیں۔میں اِس عظیم جاودانہ کاوش پر اِن کو ڈھیروں دادو تحسین پیش کرتی ہوں۔

☆☆☆

دلبر مولائی اِک نظر میں

دِلبر مولائی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔آپ کے تقریباً پندرہ نسخے اُردو و سرائیکی زبان میں منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔جن میں تحقیق و تنقید،تاریخ،سفر نامے،شاعری،انشائیہ وغیرہ شامل ہیں۔آپ متحرک شخصیت کے مالک ہیں،سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی آپ اپنا الگ مقام رکھتے ہیں معاملاتِ دینی و دُنیاوی دونوں کو آپ جذبہءِ انکساری سے سرانجام دیتے ہیں۔آپ مخلص معلم ہونے کے ساتھ ساتھ ہمدرد دوست بھی ہیں۔

آپ کی نئی کاوش "دُعائے کمیل" (سرائیکی ترجمہ) اور "پیامِ مومن" کے نام سے اُردو سرائیکی شاعری کے مجموعے منظرِ عام پہ آئے جن میں آپ نے اپنی حقیقی محبت و عقیدت اور مودتِ اہلِ بیت اطہار (علیہم السلام) کا پُر خلوص اظہار فرمایا ہے۔

خُدایا ہو کرم پنجتن ِپاکؑ دا صدقہ
ایں قوم دی جُھولی غمِ شبیرؑ توں بھر ڈے

"پیامِ مومن" 128 صفحات پہ مشتمل مودت کی وہ گلہائے عقیدت ہے جو اپنی مثال آپ ہے آپ کی شاعری میں حمد،نعت،منقبت،سہرا،قصیدہ اور استغاثہ شامل ہے۔اِن تمام اصناف میں آپ نے اپنی فنی مہارت کے جوہر دکھائے ہیں آپ کے کلام و اسلوب میں جدت آمیزی شامل ہے وطن سے محبت کا اظہار بھی آپ نے اپنے انداز میں کچھ یوں کیا ہے۔

دلبر میں ڈیروی ہوں کہیں پر ہوں ملتانی
محفوظ ہاتھ میرے ہے جھنڈا مرے وطن کا

آپ کی ادبی خدمات اُردو وسرائیکی ادب میں لائقِ صد تحسین ہیں۔ یہ مختصر الفاظ آپ کی ادبی کاوشوں کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتے۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ یہاں پر چند منتخب اشعار پیش کرنا چاہوں گی۔

اب صریرِ قلم کو ادا چاہیے
نعت کو وسعتِ ارض و سما چاہیے

غلام ہوں حُسینؑ کا
عقیدتِ بلالؓ ہے

سائل کو انگوٹھی دی اطاعت الٰہی میں
ظاہر میں عبادت ہے باطن میں سخاوت ہے

اِن چیدہ چیدہ لفظوں میں قاری کے لیے شاعری کی فنی وفکری ابلاغ کا احاطہ کرنا ناممکن نہیں البتہ اِک گمان ضرور ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے لکھے لفظوں کو معتبر کرے۔۔۔ (آمین)

☆☆☆

کھوار شاعری کا شیریں شاعر

رحمت عزیز چترالی کا نام ادب کی دُنیا میں نہایت معتبر شخصیات کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے "گلستانِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)" آپ کی کھواری زبان میں نعتیہ شاعری کا اُردو ترجمہ ہے آپ ایک بلند پایہ شاعر، ادیب، محقق اور مترجم ہیں۔آپ کے کئی زبانوں میں تراجم کی کتب کے نسخے شائع ہو چکے ہیں۔درجن سے زائد کُتب کے آپ مصنف ہیں۔شانِ سرکارِ سرورِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی مدحت کرنے کا مقدس شرف آپ کو نصیب ہوا۔تو آپ نے اپنے قارئین اور ادب سے عقیدت رکھنے والوں کو تحفے کی صورت میں اِس کو معہ ترجمہ پیش کرنے کا ذمہ بھی خود اُٹھا لیا۔آپ کا اسلوب لفظوں میں چاشنی، منفرد اندازِ بیاں آپ کی انفرادیت کا سبب ہے آقائے دو جہاں (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی مدحت سرائی میں آپ کے لہجے کی روانی ہی وجدانی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

عشقِ حقیقی میں ڈوبے مودت کے یہ سُچے موتی آپ نے جس عجز و انکساری سے رحمتِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے حضور پیش کیے ہیں وہ بے مثال و لازوال ہیں۔آپ کی یہ نئی تصنیف اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے آپ کی یہ عمدہ کاوش لائقِ صد تحسین ہے۔

☆☆☆

اولیاء کے شہر کا باسی

قیصر عمرانؔ کا نام اُردو شاعری و مرثیہ نگاری میں ایک پختہ قلمکار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ شعری مجموعہ آپ کے مشقِ سخن اور ادب پروری کا خوب صورت عکس ہے۔ آپ کے کلام میں جہاں عشقِ مجازی اور محبوب سے جُوے تمام آلام کی کیفیت ملتی ہے وہاں آپ کے مزاج پہ عشقِ حقیقی کا غلبہ بھی نمایاں ہے آپ کی محبت کا بنیادی عنصر ربِ دو جہاں کے بعد آقائے دو جہاں (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور آل پاک محمدِ مصطفیٰؐ (علیہم السلام) ہیں۔ آپ ادب سے والہانہ عقیدت رکھنے کی بنا پر نثر نگاری، کالم نویسی اور نظامت کے میدان میں بھی اپنے فنی جوہر دکھلا رہے ہیں۔ آپ کو ملکی سطح پر کئی اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

"روبرو" شعری صنفِ سخن میں ایک بیش قیمت تحفہ ہے ادب سے عقیدت رکھنے والے اس معمار کے لیے دُعاگو ہیں کہ آپ کا ادبی سفر ہمیشہ جاری و ساری رہے۔۔۔(آمین)

☆☆☆

کربلائی شاعر

ارشاد ڈیروی کا شمار سرائیکی مرثیہ کے استاد الشعراء میں ہوتا ہے۔ درجن سے زائد کتب کے خالق گولڈ میڈلسٹ اور بے شمار اعزازات اپنے نام کرنے والے یہ بزرگ اور سادہ طبیعت کے مالک ادیب وشاعر ہیں۔ آپ کی شاعری میں حمد، نعت، بند، قطعہ، سہرا، نوحے، نظم، مسدس ومنقبت شامل ہیں۔ سرائیکی شاعری میں مرثیہ نگاری پہ آج تک جتنا کام ہوا ہے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں لیکن عصرِ حاضر کے ''مرزا دبیر'' اگر ارشاد ڈیروی کو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اپنے وسیب کی طرف سے ''کربلائی شاعر'' کا خطاب بھی آپ کو ملا ہے۔ آپ کی قلم پہ باب العلم، شہنشاہ امیر المومنین مولائے کائنات سرکار (علیہم السلام) کا خاص نظرِ کرم ہے تبھی تو آپ نے ولا کی مے کا جام پی کر ''خمار خم دے'' خلق کی ہے تو کبھی قلندری پرواز کر کے ''پیام قلندر'' تخلیق کر ڈالی۔ مودت کی معراج پر ارشاد ڈیروی جب پہنچے تو ان کو ''چودھار کربلا'' ہی نظر آنے لگی۔ آپ کی دیگر تصانیف میں ''ریت سفر، پتی ریت، خواب، نین سوالی، روگ، ارشاد ڈیروی کے ڈوہڑے، رت ریت ردا، ڈاج لٹی ہوئی شام اور مقصود کربلا ہے شامل ہیں۔ آپ کی شخصیت وفن پہ اگر مکمل کام کیا جائے تو ایک دیوان تخلیق ہو سکتا ہے۔ اتنا ضخیم ونایاب کام کا احاطہ مختصر سی سطور میں کرنا ممکن نہیں۔ آپ کی پہچان اور بخشش کا سرمایہ تو یہ قطعہ بھی بہت تھا:

ہر یوم ہے عاشورا اہل من دی نت صدا ہے
ہر شام ہے غریباں نیزے تے وت ردا ہے

وت دور ہے یزیدی آ ڈیکھ آپ مولاً
ظلمت دی انتہا ہے چودھار کربلاء ہے

آپ کی قلم سے برتے گئے لفظ آپ کی خاص عقیدت خلوص اور کھرے مومن وعزادار ے مصداق ہیں۔شہید محسن نقوی صاحب کے اس شعر کے ساتھ آپ کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہوں:

عمر اتنی تو عطا کر میرے فن کو خالق
میرا دشمن میرے مرنے کی خبر کو ترسے

اللہ کرے حُسنِ رقم اور زیادہ۔۔۔

☆☆☆

سید مبارک علی شمسی کا ادبی سفر

دُنیائے ادب کی چمکتی کہکشاں میں ہر ستارے کی اِک الگ پہچان ہے اور اپنے کام و خدمات کی بناء پر ہی اُسے دیگر ستاروں میں انفرادیت حاصل ہوتی ہے۔ اِنہی ستاروں کے جھرمٹ میں ایک درخشاں ستارہ ''سید مبارک علی شمسی'' بھی ہے جو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کئی شہکار نسخوں کے خالق ہیں۔ صحافت اور حکمت و ادب کے میدان میں آپ کی شخصیت سے ہر فرد آشنا ہے۔ منفرد اسلوب اور طرزِ بیاں دونوں آپ کی منفرد شخصیت کا حوالہ ہیں آپ نے نثر میں مضامین نویسی، کالم نگاری میں طبع آزمائی کی۔ شاعری میں حمد، نعت، سلام، مرثیہ، رُباعی، کافی، منقبت، نظم، غزل، نغمہ، ہائیکو اور دیگر صنفِ سُخن میں قلم فرسائی کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ آپ کے کلام میں اُردو سے محبت کی چاشنی کا ذائقہ بھی ملتا ہے اور سچے جذبوں کو اپنے اندازِ بیاں سے رقم کرنے کا ہُنر بھی۔۔۔ اپنے خیالات، جذبات، احساسات کو مختلف انداز میں بیان کرنا کتھارسس کہلاتا ہے تاہم ایک شاعر بھی اپنے رنگِ بیاں میں لفظوں کو اپنے کتھارسس کا ذریعہ بناتا ہے لیکن صرف بیانِ تحریر ہی اصل ہُنر نہیں ہوتا جو تحریر کو لفظوں کا پیراہن پہنا کر ہر سُننے اور پڑھنے والے کے قلوب و اذہان کو اپنی گرفت میں رکھے وہی تحریر، وہی مصنف اور وہی شخصیت ہی ہمیشہ زندہ و جاوید رہتی ہے۔ آج کے اِس چہرہ سازی کے دور میں جہاں کھرے کھوٹے کی پہچان مشکل ضرور ہوگئی ہے مگر ناممکن نہیں رہی۔ وہاں شمسی صاحب جیسے محنت کش اور کہنہ مشقِ سخن افراد کی قِلت نہیں ہے۔ آپ کا کلام آپ کے سچے جذبوں کا مکمل عکاس ہے۔ ''چلو یونہی سہی'' آپ کی غزلیات کا مجموعہ ہے جس میں تمام فکری موضوعات شامل ہیں ہر غزل کا ہر شعر اپنی معنویت

اور فن کے اعتبار سے الگ منظر پیش کر رہا ہے۔سلاست خیالی آپ کی فنی خصوصیات میں سب سے اہم جُز ہے۔قطعات واشعار میں مِلی جُلی کیفیات ملتی ہیں۔کہیں غمِ دوراں سے چُور ہو جاتے ہیں اور محبوب کی آنکھوں اور لب و رُخسار کے ترانے الاپتے ہوئے جی بہلاتے ہیں۔اِس فقیرانہ مزاج شاعر کی شاعری میں بولتے حروف اور رقص کرتی غزلیں اِس کے فن کے لیے لازوال ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ادب کے قارئین کے لیے یہ کتاب ایک خوبصورت علمی تحفہ ہے۔

دُعا گو ہوں کہ ادب کے میدان میں آپ کا یہ سفر ہمیشہ اِسی جوش و جذبے سے جاری و ساری رہے۔۔۔(آمین)

اللہ کرے حُسنِ رقم اور زیادہ۔

☆☆☆

صاحبِ اسلوب شاعر۔۔۔اعظم سہیل ہارونؔ

اعظم سہیل ہارونؔ اپنے نام اور منفرد کام کی بدولت وطنِ عزیز پاکستان کے علمی وادبی حلقوں میں بہت مقبول ہیں۔ وہ صرف ادبی دنیا تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ سماجی وعوامی حلقوں میں بھی ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہے اور ان کا نام ہر زبان زدعام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کا تعلق حاصل پور کے نواحی گاؤں چک نمبر 87 فتح سے ہے۔ ان کا پیشہ وکالت ہے۔ ان کی تخلیقات میں ''ایک دریا ہے میری آنکھوں میں'' (شعری مجموعہ)، ''نور کا جلوہ'' (نعتیہ مجموعہ)، ''محبت درد کا حاصل'' (شعری مجموعہ)، ''لمحہ لمحہ قرار ہے صاحب'' (شعری مجموعہ) اور ''مدحتِ آقا علیہ السلام کے پھول'' (نعتیہ مجموعہ) شامل ہیں۔ وہ شروع سے ہی ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ وہ ایک کثیر الجہت اور کثیر المطالعہ شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کے کلام میں خالقِ حقیقی کی حمد وثناء اور نبی آخر الزماں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدح سرائی کے ساتھ ساتھ اہلِ بیت اطہار (علیہم السلام) کے فضائل ومصائب بھی شامل ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کی تقریباً ہر صنف میں بھرپور طبع آزمائی کی ہے۔ شروع سے لے کر اب تک یہ بے شمار اعزازات اور اسناد اپنے نام کر چکے ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ کلام ''لمحہ لمحہ قرار ہے صاحب'' ان کا ایک ہی بحر اور ایک ہی ردیف میں غزلیات کا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے اپنے محبوب کو ''صاحب'' سے تشبیہ دی ہے اور ''صاحب'' کی صورت انہوں نے اپنے محبوب کے خدوخال، اس سے جدائی کے نوحے، بے وفائی پر شکوے اور شکائتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے فن کا بھی بھرپور مظاہرہ کیا ہے جو انہیں عہدِ جدید کے دیگر شعراء میں ممیز اعلیٰ کرتا ہے۔ اسی تناظر میں ان کے یہ اشعار دیکھئے:

کچھ تو کچھ غور کیجیے صاحب
درد و غم اب نہ دیجیے صاحب

قرض ہم بھی اتار لیں اپنا
کچھ ادھار اب تو دیجیے صاحب

بند آنکھوں کے ہوں لفافوں میں
خود کو ترسیل کر لیا صاحب
ہو گیا ہوں میں مختصر اعظم
ان کو تفصیل کر لیا صاحب

یا پھر ان کے یہ اشعار خاطر نشین کیجیے کہ:

عشق کے راستے پہ چل کے دیکھ
کتنا مشکل ہے راستہ صاحب
غم کے دریا کو پار کرنا ہے
میرے حق میں کرو دُعا صاحب

کون کہتا ہے ، مان لیتا ہے
دل پہ کب اختیار ہے صاحب
دل کہاں ہر کسی پہ آتا ہے
اک تجھی سے تو پیار ہے صاحب

اعظم سہیل ہارون صاحب اسلوب شاعر ہیں اور ادب کی خدمت میں دن رات کوشاں ہیں۔ان کا یہ مجموعہ کلام اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔۔۔

☆☆☆

قربان حُسین کی مجبوریاں

میری سرِشت ہے میں سر اُٹھا کے چلتا ہوں
سوائے موت کے کہیں مَیں رُک نہیں سکتا
تُو مجھ کو دیکھ میرے نام کی تاریخ کو پڑھ
حُسین نام ہو جس کا وہ جُھک نہیں سکتا

قربان حُسین ایک پُختہ قلمکار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔آپ کا منفرد اسلوب آپ کو دیگر لکھاریوں میں ممیّز کرتا ہے آپ یک جہت طبیعت کے مالک ذی پایہ ہیں۔آپ کی طبیعت مصنوعی پن سے نابلد ہے شہرت طلبی کی بجائے آپ کی کوشش ہمیشہ لفظوں کا جادو جگانے پر مرکوز رہی۔چھوٹے شہر میں سکونت کے باعث آپ کو وہ مقام و مرتبہ نہیں مل پایا جو آپ کو بڑے شہر میں ہونے سے ملتا اور آج آپ کے نام و کلام کی دھوم ملکی و غیر ملکی سطح پر ہوتی آپ کی قلم سے بَرتے گئے موضوعات آپ کی جدت پسندی کے عکاس ہیں۔"پہلا چہرہ" ہو کہ "مجبوریاں"، دونوں منفرد مقام رکھتی ہیں۔آپ کے کلام میں جو بات نمایاں ملتی ہے۔پُختہ علمی، ذوفہمی، مشاہداتی فکر اور فنی بالیدگی ہے جو ماہِ تابندہ ہونے کی واضع دلیل ہے۔اہلِ بیتِ اطہارؑ سے مودت کی بنا پر آپ نے اپنا تخلص "حُسین" رکھا۔آپ کا مودت کی نسبت سے ایک شعر ملاخطہ ہو:

اے اجنبی تُو کون ہے تُو کیسے آیا ہے
مَیں کربلا ہوں سوچ لے تُو مارا جائے گا

اپنے خونِ جگر سے قرطاس کو رنگیں کرنا اور اپنے کرب رقم کرنا اس قدر سہل ہوتا تو میر

یوں نہ کبھی فرماتے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب مَیں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

قربان صاحب بھی مقلدِ میرؔ ٹھہرے آپ نے اپنے کرب کو یُونہی رقم کیا آپ فرماتے ہیں۔

مجھ کو مزاجِ شہر سے کوئی گلہ نہیں
مجھ کو میرے شعور نے سولی چڑھا دیا

''مجبوریاں'' آپ کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو کہ 168 صفحات پر مشتمل ہے اس میں غزل، بند، اشعار، قطعات، نغمے، منقبت و دیگر شعری اصناف پہ کام کیا گیا ہے۔ادب سے شغف رکھنے والے قارئین کے لیے قربان صاحب کے رتجگوں کا یہ ثمر ایک انمول تحفہ ہے۔

کچھ تو اپنی سادگی نے ظُلم ڈھائے ہیں حُسیںؔ
اور کچھ ورثہ میں پائیں مہرباں مجبوریاں

دُعا گو ہوں قربان صاحب کا شجرِ سایہ دار ادب پر تا دیر قائم و دائم رہے اور ہم ان کی شفقت سے فیض یاب ہوتے رہیں۔۔۔(آمین)

☆☆☆

رِقت آمیز لہجے کا شاعر

لفظوں کو سچے موتیوں کی بنی تسبیح کی مانند روانی سے پڑھنے والا طیار مہدی اُردو و سرائیکی ادب میں ہر خاص و عام میں مقبول ہیں۔آپ کی متعدد کُتب قارئین کی نذر ہو چکی ہیں۔ بنیادی طور پر نظم و غزل کے شاعر ہیں۔اُردو، سرائیکی دونوں زبانوں میں مشقِ سخن طرازی کر رہے ہیں اگر آپ کو سچے جذبوں کا شاعر مانا جائے تو قطعاً مضائقہ نہ ہوگا۔آپ کی سحر آمیز شاعری اور بولتے لفظ، ہجر و وصال کی تمام کیفیات کے مناظر کا جو نقشہ اپنے انداز میں بناتے ہیں قاری کے اندر رِقت قلب اور سرور کی خطِ وجدانی سی کھینچ جاتی ہے۔

حال ہی میں آپ کی کتاب ''مر گئیں آنکھیں'' منظرِ عام پر آئی جس میں بہتے جھرنوں کی روانی جیسے لفظ آپ کے پُختہ قلمکار ہونے کی دلیل ہیں۔ایک شاعر و ادیب کی سب سے بڑی پہچان اِس کا اسلوب اور اندازِ بیاں ہے جو اِسے دیگر لکھاریوں میں منفرد بناتا ہے۔ طیار خان صاحب کے برتے گئے مضامین بھی اچھوتے اور نسلِ نو کے ہر دل عزیز ہیں۔ سلاست خیالی و سلاست بیانی کے آپ گرو ہیں اِس حوالے سے اک نظم ملاحظہ ہو:

خواب

میرے سردُبت پہ

دہکتے ہوئے

تیرے ہونٹوں کی گرفت

نے

ایسا کمال کردیا۔۔۔

مجھے لازوال کردیا۔۔۔

آپ کے کلام میں حلاوت کا مزہ ہے جو کہ نامور شعراء کے کلام میں ملتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا نام وکام ہمیشہ رہنے والوں کی فہرست میں ہے۔

قارئین آپ کی کتاب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد ہی آپ کی سُخن دانی کا احاطہ کرسکتے ہیں۔

☆☆☆

نیلا طالب اور رَیم

انیلا طالب کا شمار دُنیا میں اُن کامیاب چہروں میں ہوتا ہے جو کم عمری میں ہی کامیابی کے زینے پر چڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی خُداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ اپنی پہچان کا منفرد حوالہ بن جاتے ہیں۔ انیلا طالب ایک منفرد لب ولہجہ کی پہلی نثری ہائیکو شاعرہ، بے شمار ناولز کی مصنفہ اور زندہ ہیرو کو اِن کی زندگی ہی میں خراجِ تحسین سے نوازتے ہوئے پہلا تحقیقی نسخہ منظرِ عام پر لانے والی محققہ ہیں۔

آپ کی قلم نے اچھوتے مضامین تراش کر نہ صرف اپنا بلکہ پورے ملک وقوم کا سر فخر سے بلند کیا۔ شخصیت میں عاجزی اور طبعیت میں انکساری ہے اور کیوں نہ ہو مقلدِ رومیؒ جو ٹھہریں۔ ان کی تعلیمات کو اپنا اوڑھنا بچھونا گردانتی ہیں۔

عشقِ حقیقی سے سرشارِ دِل کی مالکہ، جب اپنے تخیلات کو قلم کی نوک سے قرطاس کی زینت بنا کر اپنے قاری کے حوالے کرتی ہے۔ عشق حقیقی ہی ابدی حیات ہے جو آپ کا موضوعِ خاص ہوتا ہے آپ کے موضوعات میں آج کے منتشر ماحول اور پژمردہ آدمیت کو جھنجھوڑنے کا عمل خاص اہمیت کا حامل ہے "رَیم" ناول کو بھی مصنفہ نے اسی روحانی الاؤ میں لکھا ہے یہ صرف ایک لڑکی کی کہانی نہیں جو اپنے رب سے والہانہ عشق کرتی ہے اُس تک پہنچنے کا ذریعہ پرندوں سے محبت اور احساس سے بناتی ہے اپنی دُشوار اور پُرسوز زندگی کا مقابلہ جرات و دلیری سے کرتی ہے کیونکہ اس کا ایمان کامل اور یقین پُختہ ہوتا ہے جو اُسے ڈگمانے نہیں دیتا۔ اِس کے غم کو خوشی میں بدلنے والی قوت کا نام عشقِ حقیقی ہے "رَیم" لفظ فارسی اور انگریزی کا امتزاج ہے۔ مصنفہ کی یہ ایک شاہکار تخلیق ہے جس کو پڑھ کر قاری مدتوں اِس سحر میں تو رہے گا ہی مگر اِس کے ذریعے دیے گئے پیغام

سے یقیناً اپنی روحانی اصلاح بھی کر پائے گا جس کی اشد ضرورت آج کے نوجوان طبقے کو ہے۔ دُنیاوی لذتوں سے ہی اپنی آنکھیں خیرہ کرنا اور اِسی نشے میں مدہوش رہنا ہی زندگی نہیں ہے زندگی کا اصل مقصد اپنی وجہِ تخلیق کو پہچاننا ہے جب یہ نقطہ سمجھ آجائے تب ہی اپنے رب کی شناسائی حاصل ہوتی ہے۔ میں ان کے روشن مستقبل کے لیے دُعا گو ہوں۔

☆☆☆

آبِ زم زم

ماں کی محبت کا زندہ معجزہ ''آبِ زم زم'' قدرت کے زندہ معجزات میں سے ایک ہے۔ اس کی حرمت اور طہارت کے چرچے پوری دنیا میں ہر دور میں رہے ہیں۔ نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم بھی اس حقیقت سے روحانی عقیدت رکھتے ہیں۔ تقریباً چار ہزار سال قبل زمین سے پھوٹا یہ چشمہ اپنی اسی آب و تاب سے آج بھی جاری ہے۔ عقیدت مندوں نے اپنے اپنے انداز میں ہر دور میں اپنی محبت کا اظہار اس قدرتی معجزے سے کیا ہے مگر بھارت کے شہر کلکتہ سے تعلق رکھنے والے نامور صحافی، شاعر و محقق جناب مشتاق دربھنگوی نے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار نئے انداز میں ادا کیا کہ اس ثواب میں نہ صرف خود حصہ دار بنے بلکہ اپنے ساتھ دنیا بھر سے تمام عقیدت مندوں کو اس ثواب میں شامل کیا۔ اردو ادب کی نذر آپ کا عالمی ڈائریکٹری ''گوش بر آواز'' کرنے کے بعد ایک خوب صورت و منفرد تالیف شاعری میں ''آبِ زم زم'' دان کر دی۔ آپ کا یہ اچھوتا کام عقیدت مندوں کے لیے کسی نایاب تحفے سے کم نہیں ہے۔ آپ کی اپنے دین سے محبت و عقیدت اور اردو زبان و ادب سے گہری وابستگی و رچاؤ کی یہ کتاب دلیل ہے۔ یہ منفرد کام دین و دنیا دونوں میں آپ کی نجات کا باعث ہے۔ رہتی دنیا تک آپ کی یہ خوب صورت کاوش سنہری حروف میں یاد رکھی جائے گی۔ ربِ ذوالجلال آپ کے قلم میں مزید تاثیر عطا فرمائے۔۔۔ آمین

☆☆☆

شہرِ مراد

تھے کتابِ زندگی پر نام دونوں کے لکھے
بن گیا وہ داستاں ، میں داستاں کا اقتباس

شیریں لب ولہجے کے کمپئر، پُر تاثیر شخصیت وخوب صورت لفظوں کی مالا پرونے والا شاعر اپنے نام کی طرح شفیق اور جس کی زندگی کے ہر لمحے کا نام ادب کی مراد ہو۔ اپنی آدھی سے زائد عمر یورپ میں گزارنے کے باوجود آپ کا منتہائے مقصد ہمیشہ ترویج اردو ادب ہی رہا ہے۔ ''شریف اکیڈمی جرمنی'' کے اجراء کا مقصد بھی اسی نقطہء نظر کے تحت کیا گیا۔ آج تقریباً پوری دنیا میں جہاں جہاں شائقین اردو ادب موجود ہیں اکیڈمی کے ممبران بھی وہاں وہاں اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ شفیق مراد صاحب نے اپنے دل کے شہر کا اک لازوال نمونہ اپنی کتاب ''شہرِ مراد'' میں ہمیں دکھایا آپ کی غزل ہو یا نظم آپ کی انفرادیت کا پتہ دیتی ہے۔ آج کل کے دور کی غزل میں عموماً قافیہ پیمائی ہی ملتی ہے جبکہ آپ کے کلام میں نہ صرف کلاسیکیت وجدت کا حسین امتزاج ہے بلکہ آپ نے نئے نئے موضوعات اور مضامین کو بھی اپنے اشعار میں جگہ دی۔ آپ کی کتاب کا ابتدائی شعر ہی اپنے اندر کے مواد کا مکمل احاطہ کر رہا ہے جبکہ ذاتی طور پر مجھے کتاب کے عنوان نے بہت متاثر کیا۔ شہرِ مراد میں گھومنے اور اس کی دیدہ زیب گلیوں سے گزرنے کا جب شرف ملا تو بے اختیار میرا قلم اس کی توصیف میں اٹھ گیا۔ اپنی محسوسات کو مصنف کے رنگِ بیاں سے بیان کرنے کی سعی کرتی ہوں۔

میں اپنی ذات میں اک کائنات رکھتا ہوں
میں بے ثبات ہوں لیکن ثبات رکھتا ہوں

بس گیا ہوں ان کے دل میں اور بانہوں کا حصار
وصل کی شب ہے خدایا! یا کہ سوچوں کا سراب

آج پہلو سے مرے وہ لگ کے بیٹھا جب
مرؔاد یوں لگا جیسے کہ مہتاب قرینِ آفتاب

فکرِ معاش عشقِ بتاں سے گزر گیا
دل سے گزرنا تھا مجھے جاں سے گزر گیا

واعظ نہ درس دے مجھے اب ضبطِ عشق کا
نالہ وہی جو آہ و فغاں سے گزر گیا

عجب مشکل میں اب یہ داستاں ہے
زمیں نیچے نہ اوپر آسماں ہے

انسان تھا میں درد کی شدت سے کٹ گیا
سمٹا ہوا وجود تھا ٹکڑوں میں بٹ گیا

آنکھ پرنم ہے اور لب خاموش
بات کوئی تو یاد رہتی ہے

آدمی کو جب شعورِ آگہی آجائے گا
ظلمتیں مٹ جائیں گی اک نور سا چھا جائے گا

کوئی منزل عطا ہو میرے ان الفاظ کو مولا
یہ ایسے آبگینے ہیں جو بحر و بر میں رہتے ہیں

ایک سو چوالیس (144) صفحات کا یہ مجموعۂ غزل مصنف کی شاہکار تخلیقات کا غماز ہے۔ اس کا انتساب آپ نے اپنی رفیقہ حیات کے نام منسوب کیا ہے جو آپ سے زندگی کے خوب صورت سفر میں بہت جلد جدا ہو گئیں! شفیق مراد صاحب کا قلمی نسخہ آپ کے شائقین کے لیے انمول تحفہ ہے آپ کی گراں قدر ادبی خدمات لائقِ صد تحسین ہیں۔ ادبی دنیا میں آپ کے نام و کام کو ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا اور یاد رکھا جائے گا۔ آپ کے ایک خوب صورت شعر کو انتخاب کر کے آپ کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہوں گی۔

نہ جانے کس نے لکھا میرا قصہ
نہ جانے کون میرا ترجماں ہے

☆☆☆

مرشدِ ماھم پر اک طائرانہ نظر

مرشدِ ماھم بھلوال سے تعلق رکھنے والے عظیم دانشور اور درویش شاعر محمد یعقوب فردوسی امیر بادشاہ کی کتاب کا نام ہے۔ فردوسی صاحب کی یہ کتاب ایک سو چھہتر (176) صفحات پر مشتمل ہے اور اسے ایم ارسلان پبلیکیشنز ملتان نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ فردوسی صاحب کو پوری دنیا میں نعتیہ ماہیا نگاری کی ضخیم کتب لکھنے کا اعزاز بھی حاصل ہے جن میں ''ورفعنا لک ذکرک'' اور ''کن فکیون'' کے نام قابلِ ذکر ہیں جن کی ضخامت دو ہزار صفحات سے بھی زیادہ ہے۔ یعقوب فردوسی صاحب طویل عرصہ سے علم و ادب کی آبیاری کرنے میں مصروف ہیں اور مرکز سے دُور رہ کر بھی اپنا اور اپنی دھرتی ماں کا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ملک کے کونے کونے میں منعقد ہونے والی ادبی تقریبات میں بھی اپنی شرکت کو یقینی بنا کر وہاں بھی اپنے علاقہ کی نمائندگی کرتے رہتے ہیں۔ ان کو ملنے والے ایوارڈز کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں ''بھیل ایوارڈ''، ''کارِ خیر انٹرنیشنل ایوارڈ'' اور ''الوکیل کتاب ایوارڈ 2022ء'' سرفہرست ہیں۔

مرشدِ ماھم ان کی تازہ ترین تخلیق ہے جسے انہوں نے اپنے مرشد اور روحانی پیشوا معروف شاعر، ادیب، محقق، سینئر صحافی و سینئر کالم نگار اور روحانی سکالر مخدوم سید مبارک علی شمسی کی محبت میں مرتب کر کے ان سے محبت و عقیدت کی اک نئی تاریخ رقم کر دی ہے۔ ''مرشدِ ماھم'' میں فردوسی صاحب ''ملدی گل'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں کچھ یوں رقمطراز ہیں کہ:

''سمجھ نہیں آندی اج اپنی گل کیویں مکاواں کیوں جے ایہہ میری چوتھی کتاب اے۔ جیہڑی عشق دے ویڑے دھمالاں پاندی پھردی اے۔ میں تے اج تائیں کسے دی شان اچ اک اکھر وی نہیں لکھیا سی تے فیر کی ہویا حضرتِ عشق نیں گھنگھرو بنا دتے تے میں نچ

نچدا پیرو مرشد ولی کامل آلِ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اولادِ علی (علیہ السلام) حضرت شاہ شمس تبریز ملتانی دے بوہے جا وڑھیا تے اوتھے مینوں اک گھبرو ملیا، جیدا ناں سی سید مبارک علی شمسی تے فیر کی ہویا کہ اوناں دی شان تے اک کتاب بن گئی (مرشدِ ماھم)۔

یعقوب فردوسی کی مذکورہ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں تصوف سے کس قدر لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ قلندرانہ لباس پہنتے ہیں وہ دنیاوی عیش وعشرت کی بجائے ہمیشہ سادگی کے ساتھ زندگی گزارنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے متاعِ حیات مرشدِ ماھم کی نظر التفات ہے انہیں اپنے اردگرد، سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے غرض ہر سو مرشدِ ماھم ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ مرشدِ ماھم سید مبارک علی شمسی کو مرشد مانتے ہیں اسی لیے تو وہ برملا کہہ اٹھتے ہیں کہ:

بھاگاں والی جمیاں ہے
مبارک شمسی نوں
اساں مرشد منیا ہے

مرشدِ ماھم سے عقیدت کا اظہار ان کی اس کتاب میں جا بجا موجود ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

ایہہ پیار کہانی ہے
مبارک شاہ شمسی
ساڈا دلبر جانی ہے

اک جام پلایا ہے
مبارک شاہ شمسی
ڈیرہ دل اچ لایا ہے

وہ مرشدِ ماھم کے ہاتھ میں درِ نجف کے نگینے کی انگوٹھی کا تذکرہ کرتے ہوئے کچھ یوں

گویا ہوتے ہیں کہ:

نجف توں آئی اے
مبارک شاہ شمسی
جیہڑی مندری پائی اے

اس کتاب کے ہر شعر سے فردوسی صاحب کی اپنے مرشدِ ماھم سے والہانہ محبت و عقیدت چھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ ان کے اندازِ تکلم کا تذکرہ کرتے ہوئے بے ساختہ بول اٹھتے ہیں کہ:

دم شمسی دا بھر دے نیں
مبارک شاہ شمسی
گلاں مٹھیاں کر دے نیں

محمد یعقوب فردوسی حضرت شاہ شمس الدین سبزواری تبریزی کے کسب فیض کے طلبگار ہیں۔ وہ ایک عقیدت مند اور سادات عظام کے حب دار انسان ہیں۔ وہ مرشدِ ماھم کی جانب سے ملنے والے تبرکات کو اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں، جس کا اظہار وہ کھلے بندوں کرتے ہیں:

ملتان چوں آئی ہے
مبارک شمسی نیں
میتوں مالا پائی ہے

یا پھر ان کا یہ ماہیا دیکھئے کہ:

جاگیر او میری اے
مبارک شاہ شمسی
فوٹو جو تیری اے

اگر مرشدِ ماھم اپنے کسی عقیدت مند مرید صادق کے گھر میں قدم مبارک کرے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا اور وہ شاد دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یعقوب فردوسی صاحب بھی اپنے گھر میں مرشدِ ماھم کی آمد کو اپنے لیے باعثِ رحمت سمجھتے ہیں اور مرشدِ ماھم کو اپنی نظروں کے سامنے پا کر ان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور وہ جھومتے ہوئے یہی کہتے جاتے ہیں کہ:

مٹھا بول سنایا اے
مبارک شاہ شمسی
گھر میرے آیا اے

یعقوب فردوسی نے سید مبارک علی شمسی کے فن اور شخصیت پہ مرشدِ ماھم کی صورت میں ضخیم کتاب مرتب کر کے ان سب اپنی بے پایاں محبت وعقیدت کا حق ادا کر رہا ہے۔ بلاشبہ ان کا یہ دیوان شمسی صاحب کے فن کے ساتھ ساتھ شخصیت نگاری میں گراں قدر اضافہ ہے ۔میری دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ محمد یعقوب فردوسی کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے اور انہیں صحت وسلامتی والی زندگی عطا فرمائے۔۔۔(آمین)

☆☆☆

فصلِ آرزو

سوکھ جاتے ہیں شجر جب آس اور امید کے
لہلہاتی ہے دلوں میں کوئی فصلِ آرزو

فرزانہ فرحت کا شمار ادب کے منجھے ہوئے شعراء میں ہوتا ہے۔ ادبی حلقوں میں آپ کے نام سے شناسائی ضرور تھی مگر آپ سے مکمل آشنائی ''فصلِ آرزو'' ملنے کے بعد ہوئی۔ جو آپ کا چوتھا شاہکار مجموعہ کلام ہے۔ فرزانہ فرحت کی شخصیت وفن کو جانچنے کے لئے ان کا کلام ہی مکمل دلیل ہے۔ آپ کے جزبے کھرے اور آئینے کی مانند شفاف ہیں۔ عشقِ مجازی میں وہ دنیا کی طلب نہیں ملتی جو آج کل کے معاشرے کا المیہ بن گئی ہے۔ جنون وہوس پرستی کو عشق کا نام دیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ کہتی ہیں کہ:

عجیب دل کا رہا تھا معاملہ فرحتؔ
میں دل کے شور شرابوں میں گم رہی برسوں

اذیت اوڑھ کر لیٹی ہوں میں سوچوں کے بستر پر
کہ مجھ سے تیری الفت کے یہ غم پالے نہیں جاتے

وہ بھی اپنا نہیں رہا شاید
میں جسے مانگتی تھی سجدے میں

فرزانہ فرحت کے لب و لہجے میں نہ تو محبوب کی روایتی بے وفائی کا رونا ملتا ہے نہ وہ اس دنیائے فانی سے مایوس ملتی ہیں بلکہ وہ اپنے عشق کی مدھم الاؤ میں سلگتی دکھائی دیتی ہیں۔کبھی عید کے چاند کو دیکھ کر اپنے چاند کی یاد میں جھلستی ہیں تو کبھی خود کو غمِ دوراں کے حالات و واقعات سے جوڑ کر اپنے غموں کی پرسہ داری ملتی ہیں۔ان کا اسلوب عصرِ حاضر کی دیگر لکھاریوں سے منفرد ہے۔ان کی قلم سے برتے گئے تمام مضمون اپنے رنگ سے آرزو کی جو قوسِ قزح بناتے ہیں۔وہ قاری کے دل و دماغ پر چھا جانے والا دلفریب عکس ہے۔آپ کی اس خوب صورت کاوش پر ڈھیروں داد و تحسین۔

☆☆☆

لفظ لفظ حقیقت

رابعہ شاہین کا تعلق بابا گرو نانک دیو جی کی نگری ننکانہ صاحب سے ہے۔ادب کی یہ تازہ کلی اپنے مشاہدات اور معاشرتی حقائق کو قرطاس وقلم کی زینت بنانے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں اردو زبان میں پختگی ان کی تحاریر میں واضح نظر آتی ہے۔اپنے اندازِ بیاں سے قاری کے قلوب واذہان پر سحر طاری کرنے کا ہنر بھی رکھتی ہیں۔آپ کی پہلی کتاب ''لفظ لفظ حقیقت ''جو کہ مختصر بارہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔جو آپ نے اپنے اردگرد رونما ہونے والے حالات و واقعات کے پیشِ نظر لکھیں۔ایک لکھاری اپنے معاشرے میں ہونے والے ظلم و جور کو مشاہداتی تجزیے کی بناء پر اپنے قلم کے ذریعے ہی دیگر لوگوں تک پہنچاتا ہے تاکہ معاشرے کی ممکنہ اصلاح وفلاح کا عمل جاری رہ سکے اور مزید انتشار پھیلنے سے روکا جا سکے۔رابعہ کے ساتھ بھی ہمارے معاشرے کی ہر بیٹی والا المیہ ہے کہ والدین کی طرف سے عدم اطمینان کا اظہار جو انہوں نے اپنے ابتدائیہ میں بیان کیا ہے مگر اپنی مخفی صلاحیتوں کو مثبت انداز میں بروئے کار لانے کا ان کا یہ عزم لائقِ صد تحسین ہے۔آپ کی مزید کامیابیوں کے لئے نیک تمنائیں۔امید ہے آپ مستقبل میں اس سے بہترین تحاریر اپنے قارئین کی نذر کریں گی۔

☆☆☆

اک فوجی کی قلم سے۔۔۔

بریگیڈیئر صولت رضا (ر) فوجی افسر نے اپنے قلم سے قارئین کو اکتوبر 1975ء میں ''کاکولیات'' کے نام سے اک تحفہ نذر کیا۔ یہ کتاب پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں زیرِتربیت کیڈٹ کی پہلی آپ بیتی ہے۔اس کا اکتیسواں ایڈیشن 2021ء میں شائع ہوا اور میری خوش بختی کہ مجھے بھی اس کتاب سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ایک فوجی جس کا تربیتی مرحلہ نہایت کٹھن ہوتا ہے یوں سمجھ لیں کہ اک نفیس خدوخال کو تراش کر پتھر جیسا سخت بنانے کا عمل ہوتا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ آرمی والوں کے بنیادی اصول میں دو باتیں سکھائی جاتی ہیں Do and Die کبھی زندگی میں کسی خاکی خوب صورت سے زیادہ دل و دماغ پہ خوف طاری کر دینے والی وردی والے سے گفتگو کرنے کا موقع میسر ہی نہیں آیا یہ اتفاق بھی مجھے ''کاکولیات'' کا مطالعہ کرنے کے بعد ہوا۔ میری تو گویا کایا پلٹ گئی۔ایک فوجی کی قلم نے کچھ حد سے زیادہ حیران کیا تھا۔۔۔اتنا مضبوط والفاظ کی چابکدستی نے میرے ذہن میں بنے اس خوف کو زائل کرنے میں کافی مدد کی پھر جب آپ سے ٹیلی فونک رابطہ ہوا تو آواز اور اندازِ بیاں نہایت شیریں و اپنائیت سے بھرپور تھا کہ میرا خوف اور وہ ذہن میں شروع سے بنی ہوئی ہولناک تصویر ہوا ہوگئی۔ادب سے والہانہ عقیدت آپ کی نثری تخلیقات سے نمایاں ہے جو آپ کی طبیعت کی فطری نفاست و قلم سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آپ کی ''کاکولیات'' کے علاوہ تخلیقات میں ''غیر فوجی کالم'' ہے جو آپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد مختلف اخبارات میں کالم لکھے ان میں سے چنیدہ کالم کو آپ نے کتابی مجموعہ کی شکل دی۔ جبکہ دو کتب زیرِ طباعت ہیں۔ ''کاکولیات'' کی ترتیب آپ نے آٹھ موضوعات پر رکھی ہے۔جس کا پہلا باب آپ نے صراط کمیشن کے نام سے کیا۔اس کا انتساب ٹیپو کے نام ہے۔آپ کی یہ خوب صورت تصنیف لائقِ صد ستائش ہے اور مجھ جیسی کم فہم قاریہ کے لیے معلومات کا بیش قیمت خزینہ ہے۔

☆☆☆

ادب نواز شخصیت

پروفیسر جاوید گل گشکوری کا شمار اپنے وسیب کے پختہ قلمکاروں میں ہوتا ہے اور ادبی حلقے آپ کی موجودگی کے بناء ادھورے تصور کیے جاتے ہیں۔آپ کا بنیادی تعلق ڈی۔جی۔خان کے نواحی علاقہ محمد پور سے ہے۔لیکن عرصہ دراز سے آپ کی مستقل سکونت ڈی۔جی۔خان شہر ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے آپ پیغمبرانہ منصب سے منسلک ہیں آپ متوازن شخصیت، شاعرانہ روح کے ساتھ نرم مزاج و نفیس طبیعت کے مالک ہیں۔شعری تصنیف میں آپ کی کتاب ''خواب ادھورے رہ گئے'' زیر طباعت ہے۔آپ نے شعری میدان میں جن اصناف پہ طبع آزمائی کی۔ان میں حمد، نعت، غزل، نظم، ہائیکو، قطعہ، رباعی وغیرہ شامل ہیں۔آپ کے روحانی اساتذہ میں میر و ناصر کاظمی کا نام سرفہرست ہیں۔آپ ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔شاعری میں آپ کے دو تخلص ملتے ہیں جاوید اور گُل۔کچھ منتخب اشعار پیش کرنا چاہوں گی:

گزرا ہوں کیسے ضبط کے موسم سے کیا کہوں
پا کر بھی تجھ کو جانِ جاں کھونا پڑا بہت

کبھی تجھے جس کی چاندنی پہ تھا ناز جاوید
لو دھوپ بن کر فضا میں لہرا وہ چاند چہرہ

آپ کے کلام میں محبوب کے وصل کی چھاؤں میں بھی ہجر کے لگے زخموں اور ساگاتی دھوپ کی تپش کا گہرا رنگ دکھتا ہے۔نثری میدان میں بھی آپ نے اپنی فنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں تحقیق،تنقید اور نصاب کی کتب آپ نے تخلیق کر کے ادب کی جو خدمت کی ہے وہ لائقِ صد ستائش ہے۔ان تخلیقات میں نامور شعراء اردو، آفاق ادب، دیہی عمرانیات ، شہری عمرانیات اور میر مجلس شامل ہیں۔آپ کے فن و شخصیت پہ تحقیقی کام غازی یونیورسٹی ڈی جی خان اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں ہو چکا ہے۔آپ کا کامیاب ادبی سفر اپنے بھرپور انداز میں رواں دواں ہے آپ کے قارئین وحلقہ احباب دُعا گو ہیں کہ آپ اپنی قلم سے ادب کی آبیاری کے لیے ہردم کوشاں رہیں گے۔۔۔(آمین)

☆☆☆

زاہد اقبال بھیل کی ادبی خدمات

بھیل انٹرنیشنل لائبریری کے بانی زاہد اقبال بھیل کو سارا زمانہ جانتا ہے اور آپ کا نام ملکی وغیر ملکی سطح پر جانا مانا جاتا ہے۔ آپ کا تعلق ننکانہ صاحب جیسے چھوٹے شہر سے ہے۔ جہاں آپ نے ''بھیل ادبی سنگت'' کی بنیاد رکھی اور اپنی تمام تر کاوشیں ادب کی ترویج کے لیے وقف کر دیں۔ سالانہ بھیل انٹرنیشنل ایوارڈز تقریب آپ کی بے شمار ادبی کاوشوں کی ایک کڑی ہے جو گزشتہ چھ برس سے جاری ہے۔ اس میں نہ صرف پاکستان بھر کے شعراء و ادباء کی کثیر تعداد شرکت کرتی ہے بلکہ بیرونِ ملک سے بھی کثیر تعداد میں لکھاریوں کی کثیر تعداد شمولیت اختیار کر کے اس تقریب کو مزید چار چاند لگاتی ہے۔ بلاشبہ اس تقریب کے ذریعے شروع سے لے کر تا حال بے شمار دانشوروں اور ادیبوں میں تعریفی اسناد، ایوارڈز اور سلور و گولڈ میڈلز تقسیم کیے جا چکے ہیں۔ آپ ایک ادبی مجلہ ''قلم و قرطاس'' کے مدیرِ اعلیٰ اور سالانہ کتابی سلسلہ ''ادبی ستارے'' کی اشاعت کا اعزاز بھی رکھتے ہیں۔ بھیل ادبی انٹرنیشنل لائبریری کے نام سے آپ نے اپنی رہائش گاہ پر ایک عالیشان لائبریری بنا رکھی ہے جس میں مختلف موضوعات پر ہزاروں کتابیں موجود ہیں جن سے علم و ادب سے شغف رکھنے والے بہت سارے افراد بھرپور استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔

زاہد اقبال ایک محقق کے طور پر سامنے آئے ہیں اور انتھک محنت اور لگن سے بہت سارا تحقیقی کام سرانجام دیا ہے جو تحقیق کی دنیا کے طالب علموں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو گا اور

ادب کی دنیا میں ان کا نام مزید روشن ہوگا۔ آپ کا تحقیقی کام زور و شور سے جاری و ساری ہے۔ زاہد اقبال بھیل ایک باہمت اور باصلاحیت انسان ہیں اور اپنی بہترین حکمتِ عملی کے باعث علم و ادب کے فروغ کے لیے ہر وقت کوشاں ہیں۔ ان کے بے شمار کارنامے ان کی ذہانت و فطانت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ وہ ہمیشہ علمی و ادبی امور سر انجام دے کر اپنے ذوق و شوق کو پورا کرتے رہتے ہیں۔ آپ کی ادب سے سچی لگن آپ کو کہیں بیٹھنے نہیں دیتی۔ یہ کرب ایوارڈ، ادبی محافل، محفلِ مشاعرے وغیرہ سب اسی لگن کے مرہونِ منت ہیں، بلاشبہ آپ پر شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ:

جھپٹنا ، پلٹنا ، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

زاہد اقبال بھیل کی ادبی کاوشیں لائقِ صد تحسین اور ناقابلِ فراموش ہیں۔ دُعا گو ہوں کہ آپ کی ان لازوال کاوشوں میں خداوندِ متعال مزید برکت عطا فرمائے۔۔۔ (آمین)

☆☆☆

معظمہ نقوی

معظمہ نقوی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ ان پر شروع سے ہی شہرت کی دیوی فریفتہ ہے۔ ان کا نام اور ان کا منفرد کام ان کے ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

وہ خانوادۂ سادات کی ایک خوبصورت کلی ہیں، یہی وجہ ہے مذہب اور اسلام کی جانب ان کا رجحان زیادہ ہے، ان کا شمار عہد حاضر کی مایہ ناز خواتین لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک عرصہ سے علم وادب کی خدمت کر رہی ہیں، انہیں نظم اور نثر دونوں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور وہ وطن عزیز پاکستان کے نسائی ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہیں۔ انہیں قومی زبان اردو سمیت ماں بولی سرائیکی میں بھی سخن وری کا ملکہ حاصل ہے۔ زیر نظر کتاب "نوائے نقوی" ان کے مضامین و کالمز اور تبصروں پر مشتمل ایک ضخیم مجموعہ ہے جس میں انہوں نے کہنہ مشق شعراء کرام اور قومی ہیرو سمیت ملکی و بین الاقوامی مشاہیر ادب کی کتب پر تبصرہ جات شامل کر کے انہیں اردو ادب کی تاریخ کا حصہ بنا دیا ہے، جس پر وہ خصوصی مبارک باد کی مستحق ہیں۔ میں دعا گو ہوں کہ ان کا تخلیقی سفر اسی عزم کے ساتھ ہمیشہ جاری وساری رہے۔

آمین

سید مبارک علی شمسی



خرد کو اپنے جب کوئی نکھار لیتا ہے

فن کو اس کے وہ اوجِ لازوال دیتا ہے

معظمہ نقوی

ISBN 978-0-99-702549-1

9 780997 025491

ایم ارسلان پبلیشرز

ملتان فیصل آباد لاہور

0306-5109344

ایم. ارسلان پبلیشرز